آدمی نامہ

سنِ اشاعت ——— ۱۹۸۱ء
تعداد ——— ایک ہزار

کتابت ——— ضمیر زاہد
سرورق ——— سعادت علی خاں
طباعت ——— سنڈیکیٹ پریس، چھتہ بازار

ناشر: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ۲

اپنے بڑے بھائی

ابراہیم جلیس مرحوم

کے نام

فہرست

دو باتیں

"آدمی نامہ" ان چند شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے جو میں نے پچھلے گیارہ برسوں میں لکھے ہیں۔ میں نے پہلا خاکہ سنہ ۱۹۶۹ء میں اپنے بزرگ دوست حکیم یوسف حسین خاں کا لکھا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مرحوم کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ کئی خوبیوں کی ایک خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنے میں کم اور دوسروں میں زیادہ خوبیاں تلاش کرتے تھے۔ جب ان کی کتاب "خوابِ زلیخا" کی تقریبِ رونمائی کا مرحلہ آیا تو نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ مجھ سے اپنا خاکہ لکھنے کی فرمائش کر بیٹھے۔ اس وقت تک میں نے مزاحیہ مضامین ہی لکھے تھے۔ کسی کا خاکہ نہیں لکھا تھا، بہت عذر پیش کئے۔ پہلے تو اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا حوالہ دیا۔ یہ عذر قابلِ قبول نہ ہوا تو عمر کے اس فرق کا حوالہ دیا جو میرے اور ان کے بیچ حائل تھا۔ اس پر بھی وہ مُصر رہے کہ مجھے خاکہ لکھنا ہی ہوگا۔ یہ پہلا خاکہ تھا جسے سامعین اور صاحبِ خاکہ دونوں نے پسند فرمایا تھا۔ اب بھی ایک لحاظ سے یہ پہلا خاکہ ہی ہے۔ بعد میں جتنے خاکے لکھے انھیں اگر سامعین پسند کرتے تھے تو صاحبِ خاکہ کو ناگوار گزرتا تھا اور اگر صاحبِ خاکہ خوش ہوتے تھے تو سامعین ناخوش۔ غرض یہ کرنا چاہتا ہوں

کہ حکیم یوسف حسین خاں پر میں نے پہلا شخصی خاکہ لکھا تھا اور اس طرح میری خاکہ نگاری کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ خاکہ میرے مزاحیہ مضامین کے دوسرے مجموعے "قطع کلام" میں شامل ہے۔ اس کے بعد سے پچھلے گیارہ برسوں میں مختلف موقعوں، مختلف اغراض اور مختلف محرکات کے تحت دوستوں نے مجھ سے خاکے لکھوائے۔ اب تک پچاس سے زیادہ خاکے لکھ چکا ہوں اور قوی اندیشہ ہے کہ آگے بھی لکھتا رہوں گا۔ ان میں سے اکثر خاکے پسند بھی کئے گئے ثبوت اس بات کا یہ ہے کہ بہار کے ایک لکھ پتی ٹھیکیدار صاحب نے' جو ادب سے بھی تھوڑا بہت شغف رکھتے ہیں، دو برس پہلے اپنے تفصیلی حالاتِ زندگی روانہ کرتے ہوئے مجھ سے یہ خواہش کی تھی کہ میں ان کا بھی ایک خاکہ لکھ دوں۔ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ مُنہ مانگا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ اب اسے کیا کہیئے کہ میرے حالاتِ زندگی نے مہلت ہی نہ دی کہ میں ان کے حالاتِ زندگی سے اپنی حالتِ زندگی کا رشتہ جوڑ سکوں۔ سو یہ حالاتِ زندگی اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ قیاس اغلب ہے کہ اس کے بعد تو ان کی زندگی میں اور بھی "حالات" کی گنجائش نکل آئی ہوگی۔

مجھے ان خاکوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔ جن اصحاب کے خاکے اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان میں سے دو تین اصحاب کے بارے میں مجھے خفیہ اطلاعیں مل چکی ہیں کہ اب بھی چوری چھپے لوگوں سے استفسار کرتے رہتے ہیں کہ یہ خاکے ان کے خلاف ہیں یا ان کے حق میں ہیں۔ اپنی صفائی میں صرف اتنا عرض کرتا چلوں کہ میں نے یہ خاکے کسی کے حق میں یا خلاف بالکل نہیں لکھے جس طرح دل و دماغ نے کسی شخصیت کو قبول کیا، اُسے ہُوبہو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ خاکے میں خاکہ نگار کا زاویۂ نگاہ بھی در آتا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے تو وہ انجانے طور پر خود اپنا خاکہ بھی لکھ ڈالتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ میں نے یہ

سارے خاکے خود اپنا خاکہ لکھنے کی چاٹ میں لکھے ہیں۔

کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کے خاکے میں نے اس وقت لکھے تھے جب وہ حیات تھے۔ بھلے مانسوں کو یوں بھی اس دنیا سے جانے کی جلدی رہتی ہے میں نے انھیں جیوں کا تیوں رہنے دیا ہے۔ مجھے یہ خاکے اس لئے عزیز ہیں کہ ان میں بیتے دنوں کی خوشبو اور اچھوتے جذبوں کی مہک بسی ہوئی ہے۔

میں نے اس مجموعے کا نام نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم 'آدمی نامہ' سے لیا ہے۔ میں نے اس نظم کو دنیا کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتا ہوں ــــ نظیر اکبر آبادی نے آج سے سوا سو برس پہلے جس قسم کے آدمی اپنی نظم میں پیش کیئے تھے اُسی قماش کے آدمی آج بھی پیدا ہوتے ہیں۔ انسانیت ابھی تک نظیر اکبر آبادی کی اس نظم سے اونچی نہیں اُٹھ سکی ہے۔ آدمی پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

میں نے اس مجموعے میں کچھ آدمیوں کو الفاظ کے پنجرے میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ بس اتنا ہی کام انجام دیا ہے۔

برادرم نصیر صاحب، مالک حسامی بک ڈپو کا ممنون ہوں کہ ان کے پیہم اصرار اور تقاضوں کے باعث یہ کتاب منظرِ عام پر آرہی ہے۔ اگر انھوں نے یاد دہانیوں اور دھمکیوں کا سہارا نہ لیا ہوتا تو میری موجودہ لاپرواہی سے یہ اُمید نہ تھی کہ یہ کتاب چھپ جاتی۔

اپنے مزاح نگار دوست مسیح انجم کا شکریہ ادا کرنا اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ میری ہر کتاب کی اشاعت سے اُن کا گہرا تعلق رہا ہے جس محبّت

خلوص اور لگن کے ساتھ وہ میری کتابوں کی اشاعت میں دلچسپی لیتے ہیں اس سے مجھے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ کتابیں میری نہیں ان کی ہیں۔ موجودہ کتاب بھی مسیح انجم کی دوڑ دھوپ کے نتیجے میں منظر عام پر آرہی ہے۔

اپنے عزیز دوست مصطفےٰ کمال کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے میری عدم موجودگی میں اس کتاب کی اشاعت میں اپنا حصہ ادا کیا۔ اپنی کم مائیگی کا احساس ہمیشہ ستاتا رہے گا کہ میں ان کے خلوص کے جواب میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ وفورِ محبت سے مغلوب ہو کر ایک مرحلہ پر مخلصانہ پیش کش بھی کی کہ اگر ارشاد ہو تو اس خلوص کے عوض ناچیز آپ کا خاکہ لکھ دے۔ تیسرے ہی دن جواب آیا کہ اگر آپ میرا خاکہ لکھیں گے تو اس کتاب کی اشاعت سے میرا کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ آپ کے لئے یہ سارا خلوص محض اس ڈر سے ہے کہ کہیں آپ میرا خاکہ نہ لکھ دیں۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لئے ان کے اس تبصرہ میں میری خاکہ نگاری کے سارے اسرار و رموز (بشرطیکہ ہوں) پوشیدہ ہیں۔

مجتبیٰ حسین

۱۰۔ جنوری ۱۹۸۱ء

80/29 ، مالویہ نگر
نئی دہلی 110017

کنہیالال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں تو قطب مینار کی یاد آتی ہے اور جب قطب مینار کو دیکھتا ہوں تو آپ جان گئے ہوں گے کہ کس کی یاد آتی ہوگی۔ چونکہ دہلی میں ایسی جگہ رہتا ہوں، جہاں سے ہر دم قطب مینار سے آنکھیں چار ہوتی رہتی ہیں اسی لیے کپور صاحب بے تحاشہ، لگاتار اور بنا کوشش کے یاد آتے رہتے ہیں۔ کیا کریں مجبوری ہے۔ دہلی میں کسی اچھے علاقے میں مکان بھی تو نہیں ملتا۔ کپور صاحب اور قطب مینار میں مجھے فرق یہ نظر آیا کہ قطب مینار پر رات کے وقت ایک لال بتی جلتی رہتی ہے تاکہ ہوائی جہاز وغیرہ اُدھر کا رُخ نہ کریں۔ کپور صاحب پر رات کے وقت یہ حفاظتی انتظام نہیں ہوتا جو خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کیا پتہ کسی دن کوئی ہوائی جہاز اندھیرے میں کپور صاحب سے نبرد آزما ہو جائے اور ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے (مراد ہوائی جہاز سے ہے) ایسی ''سات منزلہ شخصیتیں'' اب بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک بار بس میں سوار ہوئے تو فوراً اپنے آپ کو یوں دوہرا تہہ کر لیا جیسے کسی نے انگریزی کے U کو اُلٹ دیا ہو۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ جب بھی اُن سے بات کی تو اُن کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی۔ ورنہ عام صورتوں میں اُن سے کھڑے کھڑے بات کیجیے تو یوں لگتا ہے جیسے آپ کسی دُور افتادہ شخص سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہوں۔ لمبا قد بھی کیا عجب شے ہے۔

کپور صاحب کو خود بھی اپنے لمبے قد کے متعلق کچھ ''خوش فہمیاں'' اور کچھ ''غلط فہمیاں'' ہیں۔ ''خوش فہمی'' کا یہ عالم ہے کہ لال قلعے کے باب الداخلہ کے نیچے سے گزرنا ہوتو اپنے سر اقدس

کو خم دے کر سینہ پر اور سینہ کو خم دے کر پیٹ پر رکھ لیتے ہیں اور ''غلط فہمی'' کا یہ عالم ہے کہ فکر تونسوی کے گھر میں پانچ فٹ طول والی چار پائی پر سو جانے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی غلط فہمیاں اور ایسی ہی خوش فہمیاں تو انسان کو طنز نگار بناتی ہیں۔ اُن کے قد کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کا حق ویسے تو مجھے بھی نہیں پہنچتا۔ کیوں کہ اکثر لوگ میری ذات کے حوالے سے لمبے آدمیوں کے احمق ہونے کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ اس کو بنیاد مان کر کپور صاحب کے قد کا اندازہ لگائیے۔ کبھی پوچھا تو نہیں کہ ناپ تول کے حساب سے اُن کا قد کتنا ہے۔ تاہم ایک بار شدید گرمی میں دہلی آئے اور مَیں نے دہلی کے موسم کے بارے میں اُن کی رائے پوچھی تو بولے'' سینے تک تو موسم بڑا جان لیوا ہے۔ البتہ گردن اور سر کے آس پاس موسم خاصا خوش گوار ہے۔'' اتنا تو ہم نے بھی جغرافیہ میں پڑھ رکھا ہے کہ آدمی سطحِ سمندر سے جوں جوں بلند ہوتا جائے گا۔ اس کے اطراف موسم خوش گوار ہوتا جائے گا، اسی لئے اُن کی بات پر فوراً ایمان لے آئے۔

اُن کے قد کے معاملے میں تو قدرت نے بڑی فیاضی دکھائی ہے البتہ اس قد کے اطراف گوشت پوست کا پلاستر چڑھانے میں بڑی کنجوسی سے کام لیا ہے۔ اتنے دُبلے پتلے ہیں کہ ملک کی غذائی صورتِ حال پر ایک مستقل طنز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہندوستان جیسے ملک میں رہتے ہیں۔ اگر مغرب کے کسی ترقی یافتہ اور خوشحال ملک میں ہوتے تو وہاں کی حکومت اس ''تہمت'' کو کب کا ملک بدر کر چکی ہوتی (دروغ بر گردنِ راوی کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب بھی ملک کو بیرونی غذائی امداد کی ضرورت ہوتی ہے تو کپور صاحب کا فوٹو بھیج کر من مانی بیرونی غذائی امداد حاصل کی جاتی ہے)۔

کپور صاحب بچپن سے میری کمزوری رہے ہیں۔ کمزوری ان معنوں میں کہ اُردو کی ایک نصابی کتاب میں اُن کا مضمون '' غالبؔ جدید شعراء کی مجلس میں'' شامل تھا اور محض اُن کا مضمون ٹھیک ڈھنگ سے یاد نہ کرنے کی وجہ سے مَیں اُردو کے پرچے میں '' کمزور'' رہ گیا تھا۔ بعد میں اُن کے اِس مضمون سے ایسی چڑ ہوئی کہ جہاں کہیں یہ مضمون دکھائی دیا فوراً منہ پھیر لیا۔ اب اسے اتفاق ہی کہئے کہ جس مضمون سے اس قدر چڑ رہی وہی مضمون لوگوں کو اِتنا پسند آیا کہ اب تک ہر انتخاب میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔ بہر حال مَیں نے اس مضمون کو چھوڑ کر کپور صاحب کے سارے مضامین پڑھے اور ان کا گرویدہ ہو گیا۔

اُن سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو اُن سے خواہش کی گئی کہ وہ حیدرآباد آکر اس کانفرنس کی صدارت کریں۔ انہیں کئی خط لکھے مگر کسی کا جواب نہ آیا۔ کرشن چندر اور مخدوم محی الدین نے بھی سفارشی خط لکھے مگر جواب ندارد (بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ خط کا جواب دینے کو خلافِ تہذیب بات سمجھتے ہیں۔) پھر آخری حربے کے طور پر جب انہیں پے بہ پے ٹیلیگرام بھیجے جانے لگے تو عاجز آکر لکھا "بابا! کیوں ہم قلندروں کے سکون میں خلل ڈالتے ہو۔ صدارت کی دعوت سر آنکھوں پر۔ مگر ڈاکٹروں نے مستقلاً لیٹے رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ بتایئے مَیں لیٹے لیٹے آپ کی کانفرنس کی صدارت کیسے کرسکتا ہوں؟" بات معقول تھی کیوں کہ ہم نے بھی کسی کو لیٹے لیٹے صدارت کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ ہم لوگ ہر سال اُنہیں حیدرآباد بلاتے اور یہ طبّی تصدیق نامہ پیش کرکے باعزت بری ہوجاتے۔ آخر تھک ہار کر ہم نے بھی اپنی دعوت کو لیٹے رہنے پر مجبور کردیا (اتنی ڈاکٹری تو ہمیں بھی آتی ہے)۔

پھر یوں ہوا کہ کئی برسوں بعد ایک دن اچانک دہلی میں میرے دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔ پیغام تھا "کنہیالال کپور آپ سے آج شام ٹی ہاؤس میں ملنا چاہتے ہیں، ٹھیک چھ بجے پہنچ جایئے۔" کسی طرح اعتبار نہ آتا تھا کہ جو قطب مینار برسوں سے لیٹا ہوا تھا وہ آخر کس طرح اُٹھ کر کھڑا ہوگیا ہے۔ مَیں بھاگا بھاگا ٹی ہاؤس پہنچا تو دیکھا کہ کپور صاحب، جاں نثار اختر اور فکر تونسوی ایک میز پر بیٹھے ہیں۔ کپور صاحب نے مجھے بڑے پیار سے گلے لگایا۔ کرسی پر بٹھایا۔ پھر کرسی پر بٹھاتے ہی ایک لطیفہ سنایا اور لطیفہ سناتے ہی میری طرف ہاتھ بڑھا کر مجھے کرسی سے کھینچا اور اس زور سے کھینچا کہ مَیں کرسی سے نیچے آگیا۔ اپنی ہنسی کو روک کر مجھے قرینے سے کرسی پر رکھا۔ کرسی پر بٹھاتے ہی پھر لطیفہ سنایا اور لطیفہ سناتے ہی میری طرف ہاتھ بڑھا کر مجھے کرسی سے کھینچا اور اس زور سے کھینچا کہ مَیں پھر کرسی سے نیچے آگیا۔ اپنی ہنسی روک کر پھر مجھے کرسی پر ـــــــ مَیں حیران ہوا تو فکر تونسوی بولے "کپور صاحب کی یہ عادت ہے کہ جب بھی کوئی اچھا فقرہ یا لطیفہ کہتے ہیں تو اُس آدمی سے بے ساختہ مصافحہ کرتے ہیں جس پر یہ بہت زیادہ مہربان ہوتے ہیں۔ مَیں خود بھی اُن کی مہربانی سے کئی بار گرچکا ہوں۔ اب یہ مہربانی تمہارے حصے میں آئی ہے۔ بیٹا! طنز نگاروں کی اور قدر کرو۔"

جاں نثار اختر مرحوم تو یوں بھی بڑے مرنجان مرنج آدمی تھے۔ فکر تونسوی کا یہ جملہ سن کر

بہ نظرِ احتیاط اپنے دونوں ہاتھ رانوں کے نیچے دبا کر بیٹھ گئے۔ مجھے کرسی سے گرانے کا شغل آدھے پون گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد کپور صاحب اس قابل ہوئے کہ میری خیریت دریافت کر سکیں۔ بہت سے آسان سوالات پوچھے جن کے جواب دینا کم از کم میرے لیے مشکل تھا۔ (کالج کے پرنسپل ہونے کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے)۔

اس پہلی ملاقات کے بعد کپور صاحب سے دہلی میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ امرتسر ٹیلیویژن سے جب بھی اُن کا کوئی پروگرام ہوتا ہے تو وہ ریکارڈنگ کے لیے دہلی آتے ہیں اور مجھے کرسی سے گرائے بغیر واپس نہیں جاتے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کپور صاحب انگریزی کے اُستاد رہے ہیں۔ لیکن یہ کھاتے ہیں انگریزی کی اور گاتے ہیں اُردو کی۔ انہیں فارسی، انگریزی اور اُردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں۔ نثر کا ایک جملہ کہتے ہیں اور اس کے فوراً بعد ایک شعر داغ دیتے ہیں۔ ایک دن ملٹن کا ایک شعر سنایا اور اس شعر کے پیچھے حافظؔ کے ایک شعر کو دوڑایا اور آخر میں حافظؔ کے اس شعر کے تعاقب میں غالبؔ کا ایک شعر چھوڑ دیا۔ پھر غالبؔ کے شعر کی عظمت کو اپنے تجزیے سے کچھ اس طرح نمایاں کرنے لگے جیسے یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ ملٹن اور حافظؔ نے اپنے شعر ''دیوانِ غالب'' سے چرائے تھے۔ واضح رہے یہ عنایتِ خاص صرف غالبؔ کے لیے نہیں بلکہ ہر اُس شاعر کے لیے ہے جو اُردو میں شعر کہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ انہوں نے مومنؔ کو ورڈسورتھ سے بھڑا کر ورڈسورتھ کو شرمندہ کیا۔ داغؔ کی ٹکر شیلی سے کرا کے شیلی کا کچومر نکالا۔ حالیؔ کو براؤننگ پر چھوڑا۔ حد ہوگئی کہ ایک دن پنڈت رتن ناتھ سرشار سے چیسٹرٹن کو چت کرا دیا۔ وہ ہر دم یہ ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں کہ دُنیا میں جتنی اچھی شاعری اور تھوڑی بہت طنز نگاری ہوئی ہے وہ اُردو میں ہوئی ہے۔ اُردو سے ایسی پڑھی لکھی محبت مَیں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اُردو کی موجودہ کسمپرسی پر جتنی طویل آہ کنہیالال کپور کھینچتے ہیں اتنی طویل آہ اُردو کا کوئی اور ادیب کھینچ کر دکھا دے تو ہم اس کے غلام ہو جائیں۔ کپور صاحب باتیں کرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ وہ گھنٹوں اپنی علمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کبھی انگریزی کبھی اُردو اور کبھی پنجابی میں۔

کبھی کبھی طنز نگار کو مزاحیہ صورتِ حال میں گرفتار دیکھنا بھی ایک انوکھا تجربہ ہوتا ہے۔ ایک بار کپور صاحب کو مَیں اس صورتِ حال میں گرفتار دیکھ چکا ہوں۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں ایک دن مزاح نگار نریندر لوتھر حیدرآباد سے آئے تو مجھ سے کہا کہ مَیں شام میں اُن سے ملنے ہوٹل جن پتھ پر

پہنچوں۔شام کے چھ بجے تھے اور مَیں اپنے اسکوٹر پر قدوائی نگر سے گزر رہا تھا کہ اچانک مجھے بس اسٹاپ پر ایک شخص نظر آیا جو بجلی کے کھمبے کی طرح کھڑا تھا۔مَیں نے سوچا ہو نہ ہو یہ کپور صاحب ہی ہوں گے۔اسکوٹر روک کے قریب گیا تو دیکھا سچ مچ کپور صاحب تھے، اُن کے ساتھ اُن کے وہ نوجوان دوست تھے جو پنجابی کے ادیب ہیں اور جو ہر بار موگا سے اُن کے ساتھ دہلی آتے ہیں۔اُن کے علاوہ ایک اور لڑکا تھا جس سے کپور صاحب محوِ کلام تھے۔مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔بولے ''مَیں آج ہی موگا سے آیا ہوں۔ٹی، وی پر ایک ریکارڈنگ تھی جو ہو چکی ہے۔'' پھر اُس نوجوان لڑکے کی طرف اشارہ کرکے کہا'' یہ میرا بھتیجہ ہے، جو یہیں قدوائی نگر میں رہتا ہے۔اس سے ملنے آ گیا تھا۔اب رات کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔ریزرویشن ہو چکی ہے۔''

مَیں نے کہا'' کپور صاحب! یہ تو آپ غضب کر رہے ہیں۔آج ہی آئے اور آج ہی واپس ہو رہے ہیں۔یہ کیا بات ہوئی۔اتفاق سے نریندر لوتھر بھی آج دہلی میں ہیں۔وہ بھی عرصہ سے آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کچھ دیر کے لیے اُن کے ہاں چلتے۔''

کپور صاحب کے بھتیجے نے کہا'' نہیں جی! یہ تو آج رات کی گاڑی سے واپس ہو رہے ہیں۔مَیں خود اُنہیں روک رہا ہوں مگر یہ رُک نہیں رہے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی کپور صاحب نے مجھ سے پوچھا۔'' نریندر لوتھر کہاں ٹھہرے ہیں؟۔'' مَیں نے فوراً ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتا دیا۔بولے'' ہم لوگ دو چار منٹ کے لیے ہی سہی وہاں ضرور پہنچ جائیں گے۔''

کپور صاحب کے بھتیجے نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا'' صاحب! اُن کی اُمید نہ رکھیے۔اُن کا کہنا ہے کہ اُن کا سامان کا لکاجی میں رکھا ہے اور اس سامان کو لے کر اُنہیں نو بجے اسٹیشن پر پہنچنا ہے۔آپ خود دہلی میں رہتے ہیں۔اندازہ لگائیے وقت کتنا کم ہے۔''

مَیں نے کہا'' اچھا تو کپور صاحب آپ سامان لے کر اسٹیشن پہنچیے۔مَیں اور لوتھر صاحب سیدھے اسٹیشن پہنچ جائیں گے مگر یہ بتائیے آپ کی گاڑی پرانی دلّی سے جائے گی یا نئی دلّی سے۔''

کپور صاحب نے حیران ہو کر اپنے نوجوان دوست کی طرف دیکھا۔پھر پوچھا'' بھئی! ہماری گاڑی کون سے اسٹیشن سے جائے گی؟'' اُن کے دوست نے سٹپٹا کر کہا۔'' موگا اسٹیشن سے جائے گی جی۔اور کیا؟''۔مَیں ان کی بدحواسی پر ہنسنے لگا تو بولے'' صاحب! پتہ نہیں گاڑی کس اسٹیشن

سے جاتی ہے، جی، دھیان نہیں رہا۔ ٹکٹ پر دیکھنا ہوگا۔''

تب مَیں نے کپور صاحب کی طرف پلٹ کر کہا ''اسٹیشن کو گولی ماریئے۔ یہ بتایئے کون سی گاڑی میں آپ کا ریزرویشن ہو چکا ہے۔ مَیں اسٹیشن کے بارے میں پتہ کرلوں گا۔''

کپور صاحب بولے ''شاید امرتسر ایکسپریس ہے۔''

مَیں نے کہا ''وہ تو دوپہر میں چلی جاتی ہے۔''

بولے ''شاید فرنٹیر میل ہے۔''

مَیں نے کہا ''مگر وہ تو صبح میں چلی جاتی ہے۔ کپور صاحب! کمال ہے آپ کو ڈھائی گھنٹے بعد سفر پر روانہ ہونا ہے اور آپ کو ابھی تک یہ پتہ نہیں ہے کہ کس گاڑی میں آپ کی ریزرویشن ہوئی ہے؟''

یہ سنتے ہی کپور صاحب نے میرے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ پھر مجھے الگ لے جا کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے۔ ''مجھ پر وکیلوں کی طرح جرح کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ مجھے تو تمہارے ادیب ہونے پر شبہ ہونے لگا ہے۔ بھتیجے کے سامنے میری بے عزتی کروار ہے ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ مَیں رات اُس کے ہاں رہوں اور مَیں اس بچے کو زیرِ بار نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے جھوٹ موٹ ہی اس سے کہہ دیا ہے کہ آج رات کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔ اُسے یہ تک نہیں بتایا ہے کہ کہاں ٹھہرا ہوں۔ ایسے میں تم نے آکر اب سڑک میرے خلاف ''شاہ کمیشن'' بٹھا دیا اور لگے جرح کرنے۔ تم فوراً یہاں سے پھوٹو۔ مَیں دس منٹ کے اندر نریندر لوتھر کے ہاں پہنچ رہا ہوں۔ کمال ہے تم لوگوں سے مِلے بنا مَیں کیسے جا سکتا ہوں۔ مَیں تو دہلی میں تین چار دن رہوں گا۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک ایک بس آ گئی۔ مَیں نے کپور صاحب اور اُن کے دوست کو فوراً بس میں سوار کروا دیا۔

بس جا چکی تو اُن کے معصوم بھتیجے نے مجھ سے کہا ''میرے چاچا جی! سچ مچ بڑے رائٹر ہیں یہ نشانی بڑے رائٹر کی ہے کہ اُسے دو گھنٹے بعد ٹرین سے جانا ہے اور اُسے ٹرین کا پتہ نہیں ہے۔ اور تو اور اُنہیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ کون سے اسٹیشن پر جانا ہے۔ مَیں اُن کی مدد کو جانا چاہتا تھا۔ مگر اُن کے نوجوان دوست نے مجھے بس میں سوار ہونے نہیں دیا۔ کہنی مار کے نیچے اُتار دیا۔ پتہ نہیں چاچا جی کو اب کتنی تکلیف ہوگی۔''

مَیں نے اُن کے معصوم بھتیجے کو تسلی دی کہ بیٹا چاچا کے لیے اتنا پریشان نہیں ہوا کرتے۔ دُنیا کا ہر چاچا اتنا ہی بڑا رائٹر ہوتا ہے۔ میری اتنی تسلی کے باوجود بھتیجے کی آنکھ میں دو چار آنسو اُمڈ آئے۔ جھوٹی تسلی بھلا کہیں سچے آنسوؤں کو روک سکتی ہے، مَیں اس لڑکے سے نپٹ کر ہوٹل جن پتھ پہنچا تو دیکھا کہ کپور صاحب نریندر لوتھر کے کمرے میں بیٹھے قہقہے لگا رہے ہیں، پہنچ کر جیسے ہی کرسی پر بیٹھا انہوں نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے پھر کرسی سے گرا دیا۔ پھر پوچھا "اتنی دیر کیوں کر دی؟" بولا۔ "آپ کے بھتیجے کو صبر کی تلقین کر رہا تھا۔" نریندر لوتھر کو ساری داستان سنائی اور خود ہی اپنے آپ پر ہنستے رہے۔

کپور صاحب کی دو بڑی کمزوریوں کا مَیں نے اب تک ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ دو کمزوریاں ہیں لاہور اور پطرس بخاری۔ یوں تو خود کپور صاحب کے ہزاروں شاگرد سارے پنجاب میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن جب اپنے اُستادِ محترم پطرس بخاری مرحوم کا ذکر کرتے ہیں تو نظریں نیچی کر کے "باادب باملاحظہ ہوشیار" بن جاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے سارے وجود پر ایک "طالب علمانہ کیفیت" طاری ہو جاتی ہے۔ دروغ برگردن راوی لاہور سے محبت کا یہ عالم ہے کہ رات کو کبھی لاہور کی طرف پیر کر کے نہیں سوتے۔ کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ جب یہ لاہور میں تھے تو نہ جانے کس طرح سو جاتے تھے، سُنا ہے کہ موگا میں بھی لاہور کے ہی خواب دیکھتے ہیں۔ دہلی کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انارکلی کی ایک جھلک پر سینکڑوں کناٹ پلیس قربان کئے جا سکتے ہیں۔

کپور صاحب نے اُردو طنز و مزاح کو کیا دیا ہے اس کا حساب کتاب تو ناقد کرتے رہیں گے۔ یہاں میں صرف اتنا کہوں گا کہ جب ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں جدید سیاسی طنز کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی تو تب کپور صاحب نے اُردو میں "جدید سیاسی طنز" کے بے مثال نمونے پیش کیے تھے۔ کنہیا لال کپور سچ مچ اُردو طنز نگاری کے قطب مینار ہیں۔ جب بھی میں قطب مینار کو دیکھتا ہوں تو دُعا کرتا ہوں کہ کپور صاحب ہمارے ادب میں یونہی سربلند و سرفراز رہیں۔

(اپریل ۱۹۷۸ء)

○○○

راجندر سنگھ بیدی

سو ہے وہ بھی آدمی

راجندر سنگھ بیدی کو کون نہیں جانتا۔ بیدی صاحب بھی اپنے آپ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، جبھی تو خود کو ''چوٹی'' کا ادیب کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو انہیں دیکھ لیجئے وہ سرتاپا ''چوٹی'' کے ادیب ہیں۔

بیدی صاحب کو ہم نے ۱۹۶۷ء میں مزاح نگاروں کی ایک کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے بلایا تھا۔ اُن کی عادت ہے کہ کوئی کام کرنے سے پہلے بہت سوچ بچار کرتے ہیں۔ چاہے سوچ بچار سے کام بگڑ ہی کیوں نہ جائے لہٰذا وہ عادتاً سوچتے رہے کہ انہیں مزاح نگاروں کی کانفرنس کی صدارت کے لئے بلانے کی آخر وجہ کیا ہے۔ بہت سوچا لیکن کوئی معقول وجہ اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن اسی بیچ اتفاقاً اُن کی نظر آئینے پر جو پڑی تو انہیں آئینے میں وہ ''معقول وجہ'' نظر آ گئی۔ فوراً رضامندی کا خط لکھا کہ میں اس کانفرنس میں آرہا ہوں۔ دروغ برگردنِ راوی بیدی صاحب جب بھی کسی مسئلے پر سوچنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو آئینہ ضرور دیکھ لیتے ہیں اور منٹوں میں فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اس نسخے سے ہم نے بھی بارہا فائدہ اُٹھایا ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا ہے تو آئینہ نہیں دیکھتے بلکہ بیدی صاحب کی تصویر کو دیکھ لیتے ہیں۔

پھر دلچسپ بات یہ ہوئی کہ انہوں نے کانفرنس کی صدارت کو قبول کرنے کا جو خط ہمیں روانہ کیا تھا اس کے ساتھ بھی ایک حادثہ پیش آیا۔ یہ خط تھا تو ہمارے نام لیکن پوسٹ مین نے اسے ہمارے گھر سے چار کلومیٹر دور رہنے والے ایک ایسے شخص کے گھر میں پھینک دیا جس کا نام تک

ہمارے نام سے مشابہ نہیں تھا۔ آج تک یہ وجہ سمجھ میں نہ آسکی کہ بیدی صاحب کا خط آخر کس طرح اس شخص کے پاس پہنچا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ان دنوں ہماری شہرت چار کلومیٹر کی دوری تک پھیل چکی تھی۔ پھر اس شخص نے خط کو کھول کر یہ پتہ چلالیا تھا کہ یہ خط اُردو کے عظیم المرتبت ادیب راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔ سو اس نے اس خط کو بڑے اہتمام کے ساتھ ہماری خدمت میں یوں پیش کیا جیسے پرانی نسل نئی نسل کو ورثہ پیش کرتی ہے۔ ہم نے لفافے پر پتہ دیکھا، وہ بالکل درست تھا۔ جب کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ یہ خط ہمارے ''محلِ وقوع'' سے چار کلومیٹر دور کیسے پہنچ گیا تو ہم نے بھی بالآخر آئینہ دیکھا۔ اصل وجہ تو خیر سمجھ میں نہیں آئی لیکن یہ ضرور پتہ چل گیا کہ بیدی صاحب نے محکمۂ ڈاک کی ابتدائی ملازمت کیوں چھوڑ دی تھی۔

اس خط کے چند دن بعد بیدی صاحب خود بہ نفسِ نفیس ''صدارت'' کرنے کے لیے حیدرآباد چلے آئے۔ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں بیدی صاحب بھی ہم سے چار کلومیٹر دور ڈلیور نہ ہو جائیں ہم خود انہیں ریسیو کرنے کے لیے ہوائی اڈے پر پہنچے (دودھ کا جلا چھاچ کو بھی پھونک کر پیتا ہے) اُن کے ساتھ یوسف ناظم بھی تھے۔ غالباً اسی وجہ سے بیدی صاحب کی شخصیت بڑی پُرکشش اور جاذبِ توجہ دکھائی دے رہی تھی۔ گرمی کے باوجود سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر سلیقہ سے پگڑی باندھے، ہونٹوں پر پان کی سرخی کے علاوہ مسکراہٹ جمائے اپنے درمیانہ قد کو سنبھالتے ہوئے جب وہ ہماری طرف آنے لگے تو ہم حیران تھے کہ اتنے بڑے ادیب کا کس طرح استقبال کریں۔ یوں بھی ان دنوں بڑی شخصیتوں کو ریسیو کرنے کا ہمیں کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ آج کی طرح معاملہ نہیں تھا کہ بڑی سے بڑی شخصیت کو منٹوں میں ''ریسیو'' کر کے پھینک دیتے ہیں۔ ہم نے اُن کے استقبال کے سلسلے میں کچھ جملے اپنے ذہن میں پہلے سے یاد کر رکھے تھے کہ ___ ''ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے اپنی گوناں گوں ادبی اور فلمی مصروفیات کے باوجود اپنا قیمتی وقت ہمیں عطا کیا۔ اور آپ نے اس کانفرنس میں شرکت کر کے اُردو طنز و مزاح پر جو احسان کیا ہے اسے رہتی دُنیا تک یاد رکھا جائے گا'' ___ کچھ اسی قسم کے جملے تھے، سوچا تھا کہ پہلے یہ جملہ کہیں گے۔ اور پھر وہ جملہ کہیں گے اور اگر انہوں نے اس جملہ کا یہ جواب دیا تو فلاں جملہ کہیں گے۔ یوسف ناظم نے ہمارا تعارف اُن سے کرایا تو ہم نے جملہ نمبر ۱ کہنے کی کوشش کی مگر بیدی صاحب نے چھوٹتے ہی ایک لطیفہ سنا دیا۔ ہم گڑبڑا کر رہ گئے۔ کچھ دیر ہنسی چلتی رہی۔ ہم نے پھر موقع کو غنیمت

جان کر ان کا ''استقبال'' کرنا چاہا مگر انہوں نے پھر ایک لطیفہ سنا کر ہمیں پسپا کر دیا۔ چار دن وہ حیدر آباد میں رہے مگر ہمیں ایک بھی استقبالیہ جملہ کہنے کا موقع نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ حیدر آباد سے جانے لگے اور انہیں وداع کرنے کا مرحلہ آیا تو تب بھی ہمارے دل میں یہ خلش رہ گئی کہ اے کاش ہم بیدی صاحب کو ریسیو کر سکتے۔

بیدی صاحب کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ''غیر رسمی حالت'' میں رہتے ہیں۔ حسرت رہ گئی کہ کبھی انہیں ''رسمی حالت'' میں بھی دیکھا جاسکے۔ لطیفے، پھڑکدار فقرے، زندگی سے لبریز باتیں، زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرنے کا اچھوتا انداز، کھلا دل، کھلا دماغ (پگڑی کے باوجود)۔ یہی باتیں بیدی صاحب کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ کیا مجال کہ کوئی اُن کی صحبت میں کوئی رسمی بات یا رسمی جملہ کہہ سکے۔ اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ وہ رونا یا دُکھی ہونا جانتے ہی نہیں۔ خوب جانتے ہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ جانتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دُکھ اور رنج کے معاملے میں بھی وہ ''غیر رسمی'' ہیں۔ اُن کی ہنسی جتنی بے ساختہ ہوتی ہے اُن کا دُکھ بھی اتنا ہی بے ساختہ ہوتا ہے۔ اُن کے اسی دورۂ حیدر آباد کی ایک یاد ہمارے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ مزاح نگاروں کے جلسے میں تو وہ محفل کو زعفران زار بناتے رہے۔ حد ہوگئی کہ لطیفہ گوئی کی محفل میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر دوسرے دن ایک ادبی محفل میں انہوں نے افسانہ سنایا تو افسانہ سناتے سناتے اچانک رونے لگے۔ بے ساختہ ہنسی تو جگہ جگہ دیکھنے کو مل جاتی ہے مگر ایسے بے ساختہ آنسو کہیں دیکھنے کو نہ ملے۔ افسانے کے آخر میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ افسانہ کم سنا رہے تھے اور رو زیادہ رہے تھے۔ ہم نے کسی افسانہ نگار کو اپنے ہی افسانے پر اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُن کے رونے میں ایک عجیب روانی اور سلاست تھی۔ آنسو تھے کہ بے ساختہ اُمڈے چلے آرہے تھے۔ جلسے کے منتظمین پریشان تھے کہ اُن کے رونے کو کس طرح روکا جائے۔ پانی کے گلاس پیش کئے گئے، پنکھا کچھ اور تیز چلایا گیا مگر بیدی صاحب کو کسی طرح قرار نہ آتا تھا۔ وہ چونکہ ہمارے مہمان تھے اس لئے ہمارے دل میں یہ خیال آیا کہ ہم ڈائس پر جا کر اُن سے کہیں کہ بیدی صاحب اَب صبر کیجئے جو ہونا تھا وہ ہو چکا، مشیتِ ایزدی کو یہی منظور تھا۔ آخر آپ کب تک آنسو بہاتے رہیں گے۔ مگر ہماری ہمت نہ پڑی کیوں کہ اس وقت حاضرین بھی بیدی صاحب کے ساتھ خوشی خوشی رونے میں مصروف تھے۔ جب آدمی بہ رضا و رغبت روتا ہے تو اسے ٹوکنا نہیں چاہئے۔ نفسیات کا یہی بنیادی اصول ہے۔

خدا خدا کر کے افسانہ ختم ہوا تو ہماری جان میں جان آئی۔ انسان ہونے کے ناطے ہم بھی اُن کے افسانے کے زیرِ اثر مغموم تھے۔ محفل سے نکل کر جانے لگے تو ہم نے بڑے بوجھل دل کے ساتھ اُن کے افسانے کی تعریف کی۔ اس پر انہوں نے خلافِ توقع ایک پھڑک دار لطیفہ سنا دیا۔ اور اپنے آنسوؤں کو یکلخت پیچھے چھوڑ کر آتش بازی کے انار کی طرح زندگی کی شگفتگی میں پرواز کر گئے۔

بات دراصل یہ ہے کہ بیدی صاحب ہمیشہ جذبوں کی سرحد پر رہتے ہیں، اور سکنڈوں میں سرحد کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر عبور کر لیتے ہیں۔ اُن کی ذات ''جھٹپٹے کا وقت'' ہے۔ برسات کے موسم میں آپ نے کبھی یہ منظر دیکھا ہوگا کہ ایک طرف تو ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہے اور دوسری طرف آسمان پر دُھلا دُھلایا سورج چھما چھم چمک رہا ہے۔ اس منظر کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے تو سمجھئے کہ آپ اس منظر میں نہیں بیدی صاحب کی شخصیت میں دور تک چلے گئے ہیں۔ اُن کی ذات میں ہر دم سورج اسی طرح چمکتا ہے اور اسی طرح ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہوتی ہے۔ ایسا منظر شاذونادر ہی دکھائی دیتا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ بیدی صاحب جیسی شخصیتیں بھی اِس دنیا میں شاذونادر ہی دکھائی دیتی ہیں۔

اُردو میں ایک لفظ ''رقیق القلب'' ہوتا ہے۔ ہم ایک عرصہ سے اس لفظ کو کسی موزوں شخصیت کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے مگر ہمیں آج تک ایسا شخص نہیں ملا تھا۔ اگر خدانخواستہ بیدی صاحب سے ہماری ملاقات نہ ہوتی تو ہم اُردو زبان کے اس لفظ کو کبھی استعمال نہ کر پاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اس لفظ کے املا تک بھول چکے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی لغاتِ کشوری کو دیکھ کر اس لفظ کو لکھ رہے ہیں۔

بیدی صاحب سے بمبئی اور دہلی میں کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ہر جگہ، ہر مقام، ہر طول البلد اور عرض البلد پر انہیں یکساں پایا ہے۔ جب بھی بمبئی جانا ہوتا تو ہم پہلے یوسف ناظم کے ہاں چلے جاتے جن کے پچھلے دفتر اور بیدی صاحب کے موجودہ دفتر میں STONE THROW DISTANCE (پتھر پھینک فاصلہ) ہے۔ ۱۹۶۸ میں ہم پہلی بار اُن کے دفتر ''ڈاچی فلمس'' گئے تو دیکھا کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں بیدی صاحب بیٹھے ہیں اور دفتر میں موجود لوگوں کو مٹھائی کھلا رہے ہیں۔ مٹھائی کھلانے کی وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ اُن کی فلم ''دستک'' کی میریٹری'' TERRITORY ''فروخت ہو چکی ہے۔ دوسرے سال پھر ہم گئے تو تب بھی مٹھائی

پیش کی گئی۔ پھر وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ اب دوسری ٹیریٹری فروخت ہوئی ہے۔ تیسرے سال پھر جانا ہوا تو پھر مٹھائی سامنے آئی، پوچھا '' کیا اب تیسری ٹیریٹری فروخت ہوئی ہے؟'' ہنس کر بولے ''نہیں یہ پچھلے سال کی ہی مٹھائی ہے جو بچ گئی تھی، شوق سے کھائیے۔''

اپنے دفتر میں وہ فلمی اداکاروں، فلم ٹیکنیشنوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں ہنسی مذاق کی باتیں ہورہی تھیں کہ کسی نے گیتا بالی کا ذکر چھیڑ دیا اور بیدی صاحب کی ذات میں چمکتے سورج کے پس منظر میں اچانک ہلکی سی پھوار برسنے لگی۔ انہیں دیکھ کر کسی معصوم بچے کی یاد آجاتی ہے جو بیک وقت ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔

اُن کی فلمی مصروفیات کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے البتہ اُن کی فلمیں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ایڈوانس بکنگ کرائے بغیر ضرور دیکھی ہیں اور یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے ادب اور اُن کی فلموں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ خواجہ احمد عباس کی طرح نہیں کہ اُن کی فلم دیکھئے تو احساس ہوتا ہے کہ آپ بلٹز کا آخری صفحہ پڑھ رہے ہیں اور بلٹز کا آخری صفحہ دیکھئے تو لگتا ہے آپ ان کی فلم پڑھ رہے ہیں۔

ہندی کے مزاح نگار رام رکھ منہر نے ہمیں ایک بار بیدی صاحب کا ایک لطیفہ سنایا تھا، آپ کو بھی سنائے دیتے ہیں۔ بیدی صاحب جب '' دستک'' بنا چکے تو ایک نوجوان اُن کے پاس یہ درخواست لے کر آیا کہ وہ اسے اپنی کسی فلم میں کام کرنے کا موقع دیں۔ بیدی صاحب بولے ''بھئی، میں نے اپنی ساری اگلی فلموں کی دس سال تک کی پلاننگ کرلی ہے اور سارے اداکاروں کا انتخاب کرلیا ہے۔ اب تو میں تمہیں کوئی موقع نہیں دے سکتا۔ اگر تم چاہو تو دس سال بعد آکر مجھ سے پتہ کرلینا۔''

نوجوان نے واپس جاتے ہوئے کہا'' تب تو ٹھیک ہے۔ میں دس سال بعد پھر آؤں گا مگر یہ بتائیے آپ سے ملنے کے لئے صبح کے وقت آؤں یا شام میں۔''

مشکل یہ ہے کہ بیدی صاحب خود اپنے بارے میں لطیفے گھڑنے میں مصروف رہتے ہیں اور پھر خود ہی انہیں سماج میں چلا دیتے ہیں۔

وہ اپنی ذات کے بارے میں ہونے والے مذاق کو نہ صرف عام کرتے ہیں بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوا کرتے ہیں۔ یوسف ناظم نے ایک بار اُن کی فلم '' دستک'' پر تبصرہ کرتے ہوئے

بیدی صاحب سے کہا'' بیدی صاحب، آپ نے یہ فلم صرف '' دس تک'' کیوں بنائی۔ بنانا ہی تھا تو گیارہ تک بناتے، بارہ تک بناتے'' ــــــ بیدی صاحب بہت مزہ لے کر یوسف ناظم کا تبصرہ دوستوں کو سنایا کرتے۔

اُن کی باتیں بہت دلچسپ اور بے ساختہ ہوتی ہیں۔ایک بار دہلی کی ایک محفل میں بشیر بدر کو کلام سنانے کے لئے بلایا گیا تو بیدی صاحب نے جو میرے برابر بیٹھے تھے، اچانک میرے کان میں کہا'' یار ہم نے در بدر، ملک بدر اور شہر بدر تو سنا تھا یہ بشیر بدر کیا ہوتا ہے۔''

میں نے زور سے قہقہہ لگایا تو اچانک یوں سنجیدہ بن گئے جیسے انہوں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

سردار جعفری کے رسالہ'' گفتگو'' کے ایک شمارہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بولے'' اس شمارہ میں'' گفت'' کم اور'' گو'' زیادہ ہے۔افسانہ نگار واجدہ تبسم کا جب بھی ذکر کرتے تو مذاق میں ان کا نام'' والدہ تبسم'' لیا کرتے۔

اُن کی کتنی باتیں اب یاد آرہی ہیں۔دہلی میں ایک مسلمان دوست کے گھر اُن کی دعوت تھی۔دعوت بہت پر تکلف تھی۔کباب کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر اس کے ذائقہ کی تعریف کرتے ہوئے بولے'' بھئی مسلمان کا گوشت بے حد لذیذ ہوتا ہے۔''

سکھوں کے جتنے لطیفے اُنہیں یاد ہیں اتنے شاید ہی کسی کو یاد ہوں۔اپنے حوالے سے کہا کرتے ہیں کہ'' لاہور میں میرے گھر کے آگے ایک بھینس بندھی رہتی تھی جس پر میرے دوستوں کو اعتراض ہوا کرتا تھا۔ایک دن ایک دوست نے سختی سے اعتراض کیا تو میں نے کہا بھئی ہندو کا محبوب جانور گائے ہے اور مسلمانوں کا محبوب جانور اونٹ ہے، کیا ہم سکھوں کو اپنے محبوب جانور بھینس کو پالنے کا حق نہیں ہے۔''

وہ زندگی میں یکسانیت اور یک رنگی کو بہت دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔دو سال پہلے کی بات ہے، وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں '' اُردو ادب میں عصری حسیت'' کے موضوع پر ایک سیمینار میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ہندوستان بھر کے ادیب اس سیمینار میں جمع تھے اور اُردو ادب میں '' عصری حسیت'' کو تلاش کرنے میں جٹے ہوئے تھے۔تین دن تک کچھ ایسی سنجیدگی کے ساتھ ادب میں عصری حسیت کی تلاش جاری رہی کہ ہم جیسے بھی بے حس ہو گئے۔بیدی صاحب کو تین دن بعد اس سیمینار کا خطبۂ صدارت پڑھنا تھا۔بارے خدا جب انہوں نے خطبۂ صدارت پڑھا تو شگفتگی اور

لطافت کے ایسے دریا بہادیئے کہ سیمینار کی ساری ''عصری حسیت'' اس بہاؤ میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔ جو لوگ عصری حسیت سے مغلوب ہو کر مسکرانے کو ''غیر عصری حسیت'' سمجھنے لگے تھے وہ بھی قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے۔

بیدی صاحب نے اپنے باغ و بہار خطبۂ صدارت کے ذریعہ لوگوں کے دماغوں سے سیمینار کے گرد و غبار کو صاف کیا اور انہیں اپنی ''اصلی عصری حالت'' پر لے آئے۔ اگر اس سیمینار کے بعد بیدی صاحب کا خطبۂ صدارت نہ ہوتا تو آج بھی بہت سے ادیبوں کی ذاتوں میں یہ سیمینار بدستور منعقد ہوتا رہتا۔

ہمیں یاد ہے کہ اُن کے اس خطبۂ صدارت کی داد بھی لوگوں نے اچھوتے ڈھنگ سے دی۔ یوں کہئے کہ سچ مچ ''عصری داد'' دی۔ پہلے تو لوگ بیٹھ کر تالیاں بجاتے رہے۔ پھر اچانک نہ جانے جی میں کیا آئی کہ سب کے سب اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔ پانچ سات منٹ تک تو بیدی صاحب اس داد کو ہنسی خوشی برداشت کرتے رہے۔ لیکن اچانک ان کی ''عصری حسیت'' جاگ اُٹھی اور وفورِ جذبات سے اُن کی آنکھوں میں جھیل سی بہہ نکلی۔ تب تو لوگوں کو مجبوراً اپنی داد روکنی پڑی ؎

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بیدی صاحب کی ایک اور خوبی یا خرابی یہ ہے کہ وہ کبھی ''ادب کی سیاست'' کے چکر میں نہیں رہے۔ جو کچھ لکھنا ہوتا ہے لکھ کر بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ لوگ اُن کے ادب کو چاہے کسی خانے میں رکھ دیں اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ اس ادا سے انہیں فائدہ پہنچا ہے یا نقصان، یہ اُن کے ناقد جانیں۔

بیدی صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کا حافظہ خاصا کمزور ہے۔ وہ اپنے قریبی دوستوں کے نام بھی بھول جاتے ہیں۔ اس لئے یوسف ناظم نے بیدی صاحب کی شخصیت پر اپنے بھرپور مضمون میں بیدی صاحب کے دوستوں کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ وہ جب بھی اُن سے ملیں تو حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنا نام ضرور بتا دیں، اسی میں دونوں فریقوں کی عافیت ہے۔

اس مخلصانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے جب ہم نے پچھلی بار دہلی میں بیدی صاحب سے ملنے کے بعد اپنا نام بھی بتا دیا تو بولے ''میں جانتا ہوں آپ مجھ پر لکھے گئے ایک مزاحیہ خاکے کی

بنا پر یہ حرکت کر رہے ہیں جب کہ بات ایسی نہیں ہے۔ میرا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے۔"

ہم نے پوچھا "بیدی صاحب یہ خاکہ کس نے لکھا تھا؟"

بولے "اس وقت لکھنے والے کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔"

ایک سال پہلے یوسف ناظم نے ہمیں بتایا کہ بیدی صاحب کسی بات پر ہم سے ناراض ہیں۔ ہم نے یوسف ناظم سے پوچھا "اگر آپ کہیں تو میں بیدی صاحب کو خط لکھ دوں اور اگر وہ کسی بات پر خفا ہوں تو معافی مانگ لوں۔"

یوسف ناظم بولے "خط لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے کمزور حافظے پر پورا بھروسہ رکھو، وہ یہ بات بہت جلد بھول جائیں گے۔"

بیدی صاحب کا حافظہ چاہے کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو مگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ کئی صدیوں تک آنے والی نسلوں کے حافظے میں اسی طرح قہقہے لگاتے، آنسو بہاتے اور زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہوئے موجود رہیں گے۔

(جولائی ۱۹۷۸ء)

○○○

انگریزی کے شہرۂ آفاق ادیب مارک ٹوئن نے ایک ادبی محفل میں اس طرح تقریر کی تھی: "دوستو! انگریزی ادب پر بڑا برا وقت آن پڑا ہے۔ شیکسپیر اب ہمارے درمیان نہیں رہا۔ ملٹن اللہ کو پیارا ہو چکا۔ ورڈسورتھ بھی اس جہاں سے کوچ کر چکا۔ اور تو اور پچھلے چند دنوں سے میری صحت بھی خراب چل رہی ہے"!

اعجاز صدیقی کے بارے میں لکھتے ہوئے نہ جانے کیوں مارک ٹوئن کی یہ تقریر بے ساختہ یاد آ گئی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ اردو ادب پر سچ مچ برا وقت آن پڑا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اعجاز صاحب بھی ہر بات کا سلسلہ اپنی خرابیٔ صحت سے جوڑنے کے عادی تھے۔ مسئلہ ادب کا ہو یا سیاست کا وہ اپنی خرابیٔ صحت کا سلسلہ اس سے ضرور جوڑ دیا کرتے تھے۔ میرے پاس اُن کے بے شمار خطوط ہیں۔ ہر خط کے آغاز

یں یا آخر میں وہ اپنی بیماری کا ذکر بڑی تفصیل اور بڑے ذوق وشوق کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ راقم الوقت بیماری کا ذکر کچھ ایسی اپنائیت اور چاؤ سے کیا کرتے تھے کہ لگتا تھا انھیں اس بیماری سے پیار ہو گیا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہوتی تھی کہ ہر خط میں ایک نئی بیماری کا ذکر ہوتا تھا۔ اور جب وہ اپنے مخصوص اندازِ بیان اور اچھوتے اسلوب کے ذریعے اس بیماری کی جزئیات پر روشنی ڈالنے لگتے تو ایک سماں سا باندھ دیتے تھے اور زیرِ تجربہ بیماری میں ایک نئی جان پیدا کر دیتے تھے۔ بارہ تیرہ سال سے اُن سے خط وکتابت تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے کسی خط میں اپنی بیماری کا "دوسرا ایڈیشن" نکالا ہو۔ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اُن کی ہر بیماری نہ صرف یہ کہ "غیر مطبوعہ" ہوا کرتی تھی بلکہ "قابلِ اشاعت" بھی ہوا کرتی تھی۔ اُن کی بیماریوں میں بھی ایک قسم کا تنوع تھا۔

ع ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی

اکثر بیماریوں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ اعجاز صاحب کے خطوں کے ذریعے ہی ہوا۔ میں اکثر مذاق میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ اعجاز صاحب نے بیماریوں کا اتنا عملی تجربہ حاصل کر لیا ہے کہ کوئی یونیورسٹی انھیں اس تجربہ کی بنا پر ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری دے سکتی ہے۔ عملی تجربہ علم سے کہیں زیادہ معتبر اور مستند ہوتا ہے۔ دو سال پہلے کی بات ہے، دوستوں کی محفل میں ایک صاحب نے شرط لگائی کہ اگر کوئی شخص اعجاز صاحب کا ایسا خط بتلا دے جس میں کسی بیماری کا ذکر نہ ہو تو وہ اُسے سو روپے دیں گے۔ ایک شاعر نے بڑی کوشش کے بعد

ایک خط ایسا حاصل کیا اور آن صاحب سے شرط کی رقم کا طلبگار ہوا۔ یہ صاحب بہت سٹپٹائے اس لئے کہ اس خط میں سچ مچ کسی بیماری کا ذکر نہیں تھا۔ اعجاز صاحب کی اس غیر متوقع شکست مندی سے مایوس ہو کر جب یہ صاحب پوسٹ کارڈ نیچے رکھنے لگے تو اچانک اُن کی نظر پوسٹ کارڈ کے اُس حصے پر پڑی جہاں ڈاک کی مہریں لگی ہوتی ہیں۔ وہاں نہایت خفی حروف میں لکھا تھا ــــــ "بستر علالت سے"

اُن کی شخصیت کا یہ ایک عجیب و غریب گوشہ تھا کہ وہ دوستوں اور ملاقاتیوں کو اپنی خرابی صحت سے ضرور آگاہ کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جب بھی اُن سے ملاقات ہوئی تو وہ اتنی ساری بیماریوں کے باوجود چاق و چوبند اور زندگی کے سفر میں سرگرم عمل دکھائی دیتے۔ میرا دعویٰ ہے کہ وہ جتنا کام کرتے تھے اتنا کام ہم جیسے کئی صحت مند آدمی مل کر بھی انجام نہیں دے سکتے۔ انھیں دیکھ کر جی چاہتا کہ ملے کاش ہم بھی اتنی بیماریوں میں مبتلا ہوں اور ہمیں بھی اتنا کام کرنے کی توفیق عطا ہو۔ دیکھنے کو وہ تھے تو دھان پان سے آدمی لیکن ان میں کام کرنے کی لگن اور جستجو کچھ ایسی تھی کہ ہر وقت کام میں لگے رہتے تھے۔

اُن سے خط و کتابت تو بہت پہلے سے تھی لیکن اُن سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۸ء میں ہوئی جب خواجہ عبدالغفور صاحب کی دعوت پر "سرسنگار سمد" کے تہنیتی پروگرام میں شرکت کے لئے بمبئی گیا۔ اعجاز صاحب کی ایک خوبی یہ بیان کر دوں کہ وہ ہر ادیب سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ ادیب چاہے چھوٹا ہو یا بڑا اسے

وہ ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ چھوٹوں سے ملتے بھی تو ان پر اپنی بزرگی کو لادنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ادب کے دیگر بزرگوں کی طرح نہیں کہ جہاں کوئی چھوٹا دکھائی دیا اس کے سر پر اپنی بزرگی کا بھاری بھر لاد دیا۔ اور چھوٹوں کی قوتِ برداشت کا تماشہ دیکھتے رہے۔ اعجاز صاحب میں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ وہ رسالوں کے دیگر مدیروں کی طرح نہیں تھے کہ اپنے قلمکاروں سے ناز اٹھواتے پھریں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنے ماہنامہ "شاعر" کے لیے ہر حلقے سے بھرپور تعاون ملتا تھا۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۸ء میں ہوئی تھی۔ میں بمبئی میں خواجہ عبدالغفور صاحب کا مہمان تھا۔ جیسے ہی بمبئی پہنچا ان کا فون آیا کہ "شاعر" کے دفتر پر کب آ رہے ہو۔ میں نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کر لیا۔ ان کے بڑے لڑکے تاجدار احتشام سے میری دوستی تھی مگر کبھی اعجاز صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی بس ان سے خط و کتابت تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ جب ان سے ملاقات ہو تو تاجدار بھی موجود رہیں۔ اس لئے کہ بزرگوں سے ملتے ہوئے یوں بھی طبیعت بوجھل سی ہو جاتی ہے۔ اپنی افتادِ طبع کے باعث میں بزرگوں اور حد سے زیادہ شریف آدمیوں سے ملتے ہوئے بہت گھبراتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ ملاقات نہ کر رہے ہوں بلکہ کسی ملازمت کا انٹرویو دے رہے ہوں۔ زیادہ دیر تک احتیاط سے سانس لینا اور اپنے اعصاب پر تناؤ کو مسلط کرنا کبھی بھی پسند نہ آیا۔ لہٰذا میں نے اعجاز صاحب سے گذارش کی کہ "اگر تاجدار بھی اس وقت موجود رہیں تو مناسب ہے۔"

بولے "تاجدار تو آپ سے بعد میں مل لیں گے۔ آپ کے دوست جو ٹھہرے مگر کبھی ہمیں بھی ملاقات کا موقع دیجئے"۔

میں نے اُن کے دفتر کا پتہ پوچھا تو بولے "خواجہ عبدالغفور صاحب یا یوسف ناظم صاحب سے پتہ پوچھ کر آجائیے۔ بہت آسان پتہ ہے"۔

میں نے کہا "آسان پتہ ہے تو آپ ہی بتا دیجئے"۔

بولے "آپ یوسف ناظم سے پوچھ لیجئے"۔

میں نے غفور صاحب سے "شاعر" کا آسان پتہ پوچھا تو انہوں نے مجھے یوسف ناظم سے رجوع کیا کہ اُن سے یہ آسان پتہ پوچھ لیجئے۔ میں یوسف ناظم کے ہاں پتہ پوچھنے گیا تو انھوں نے مجھے جواباً ایک ٹیکسی میں بٹھا دیا۔ ٹیکسی چلنے لگی تو میں نے کہا "مجھے پتہ تو بتا دیجئے"۔

بولے "میں نے ٹیکسی والے کو پتہ سمجھا دیا ہے۔ آپ پتہ سمجھ کر کیا کریں گے"۔

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی والے نے مجھے ایک ایسی جگہ اُتار دیا جہاں کھڑکیوں اور دروازوں میں کئی شوخ حسینائیں کھڑی "دعوتِ عیش" دے رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف چار منزلہ عمارتیں ایستادہ تھیں اور ان عمارتوں کی کھڑکیوں میں سے "حسن" اُبلا پڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اس ماحول میں پہنچ کر حیران سا رہ گیا۔ مجھے یہ تک یاد نہیں رہا کہ میں اعجاز صدیقی صاحب سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ نوبت وہی تھی کہ ع

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ

پھر اِدھر اُدھر گھوم کر "شاعر" کا بورڈ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ہر کوشش میں کسی حسینہ سے آنکھیں "دو تین" ہو گئیں۔ چار اس لیے نہیں ہوئیں کہ نظریں ملتے ہی حسینہ کی ایک آنکھ بند ہو جاتی تھی۔ مجھے اس وقت قدیم قصّے کہانیاں بے ساختہ یاد آئیں جن میں آدمی "گوہرِ مقصود" کو حاصل کرنے کے لیے نکلتا تھا تو راستے میں جگہ جگہ اس کی "صدقِ دلی" کا امتحان لیا جاتا تھا۔ اسے "صراطِ مستقیم" سے بھٹکانے کی پوری کوشش کی جاتی تھی۔ میں نے بھی دل میں ٹھان لی کہ چاہے کچھ بھی ہو میں ہر آزمائش سے گزر کر اپنے گوہرِ مقصود یعنی اعجاز صاحب تک پہنچ جاؤں گا۔ تاہم میں سخت پریشان تھا کہ اس "بازارِ حسن" میں اعجاز صاحب کو آخر کہاں تلاش کروں۔ بالآخر مجھے ایک پنواڑی کی دکان نظر آگئی جس پہ جابجا اردو شعر لکھے ہوئے تھے۔ دو شعر اب تک یاد ہیں۔

ع مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

ع درو دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اگرچہ ان اشعار کا پنواڑی کے کاروبار سے کوئی راست تعلق نہیں تھا مگر میں نے سوچا کہ آدمی سخن فہم معلوم ہوتا ہے، اسے "شاعر" کا پتہ ضرور معلوم ہوگا۔ لہٰذا میں نے بڑی پُر اُمید نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا
"بھئی یہاں "شاعر" کا دفتر کہاں ہے؟"

نیواڑی نے بڑی بے نیازی کے ساتھ جواب دیا "حضور! آپ کہاں شاعر کو تلاش کرنے آئے ہیں۔ یہاں کوئی شاعر واعر نہیں رہتا۔ یہاں تو صرف غزلیں رہتی ہیں اور وہ بھی بغیر مقطع والی۔ جب مجسم غزلیں آپ کے سامنے ہوں تو شاعر کو لے کر کیا کیجیئے گا؟"

اس سخن فہم نیواڑی کے جواب سے میں مایوس ہو گیا۔ اسی اثنا میں میری نظر سامنے والی بلڈنگ پر پڑی تو دیکھا کہ حسیناؤں کے اس جھرمٹ سے ذرا دور تیسری یا چوتھی منزل کی ایک کھڑکی سے ایک نحیف و نزار شخص کا چہرہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو یہی اعجاز صاحب ہوں گے۔ میں جا بجا اپنے ضبط کا امتحان دیتے ہوئے جب صحیح و سالم حالت میں تیسری منزل پر پہنچا تو سچ مچ یہ "شاعر" کا دفتر تھا اور اعجاز صاحب میرے منتظر تھے۔ جاتے ہی گلے سے لگا لیا۔ بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر پوچھا "آپ کو یہاں پہنچنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا "تکلیف! کیسی تکلیف؟ مجھے تو یہاں آکر خوشی ہوئی ہے"۔

اعجاز صاحب اور بازار حسن دونوں سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ کتابوں رسالوں، خطوط اور مسودوں کے بھاری انبار کے درمیان ایک تخت پر بیٹھے تھے۔ غالباً کسی کو خط لکھ رہے تھے۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے کچھ ایسی بے تکلفی اور اپنائیت کا ثبوت دیا کہ ان کی "بزرگی" پر پیار سا آگیا۔

حسب عادت پہلے تو اپنی بیماریوں کا حال بیان کرتے رہے پھر اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو طلب کر کے ملوایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے بچوں

کے ساتھ بھی "دوستانہ برتاؤ" کرتے تھے۔

ہمارے ہاں بعض شاعر اور ادیب "پیدائشی" ہوتے ہیں لیکن "پیدائشی مد
یر" میں نے اعجاز صاحب کے علاوہ کوئی نہیں دیکھا۔ اپنے رسالے کے لئے ادیبوں
کا تعاون وہ جس طرح حاصل کرتے تھے اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اُن کا معمول
تھا کہ ادیبوں کو بڑی پابندی سے خط لکھتے تھے۔ مضمون کے لئے پہلے ان کا خط آتا
تھا، پھر چند دنوں بعد یاددہانی کا خط آتا تھا۔ اس کا جواب نہ دیا جائے تو تیسرا خط آتا
تھا جس کی پیشانی پر لال روشنائی سے "اشد ضروری" لکھا ہوتا تھا۔ پھر خط کے
متن میں کئی جملے لال روشنائی سے خط کشیدہ ہوتے تھے۔ (کچھ احباب کا خیال
تھا کہ وہ تینوں خط ایک ہی وقت میں لکھ لیتے تھے جنہیں وہ وقفہ وقفہ سے
پوسٹ کر دیتے تھے) اس بیچ بمبئی سے کوئی آتا تھا تو زبانی یاددہانی سے بھی
باز نہیں آتے تھے۔ اس کے بعد بھی ادیب ٹس سے مس نہ ہو تو ٹیلیگرام کرنے
لگتے تھے۔ میں نے "شاعر" کے لئے اکثر مضامین اُن کے "اشد ضروری"
والے خط کے بعد ہی بھیجے۔ ایک مضمون ٹیلیگرام کے بعد بھیجا تھا۔ ایک بار کچھ یوں
ہوا کہ مضمون کے لئے میرے پاس اُن کا پہلا خط آیا۔ اتفاق سے میرے پاس ایک
مضمون تیار تھا سو میں نے فوراً مضمون بھیج دیا۔ اس پر اُنھوں نے حیران ہو کر خط
لکھا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اندر کچھ خرابیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔
پہلے ہی خط پر مضمون بھیج دیا۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ کسی اچھے ڈاکٹر کو
دکھایئے اور اپنا علاج کرایئے۔" وہ ادیبوں اور شاعروں کے مزاج سے

دب واقف تھے۔ وہ دیگر مدیروں کی طرح نہیں تھے کہ کسی ادیب کی کوئی چیز چھاپ
یہ سمجھ لیا کہ اس ادیب کی سات پشتوں پر احسان کر دیا ہے۔ اعجاز صاحب کا
عاملہ بالکل اُلٹا تھا۔ وہ اپنی کسر نفسی، عجز و انکسار کے باعث یہی سمجھتے تھے کہ ادیب
نے اُن پر احسان کیا ہے۔

مجھے اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ یہ جو "شاعر" میں پچھلے چار برسوں سے
یبوں اور شاعروں کے گوشے شائع ہو رہے ہیں تو اُن کا آغاز میری ہی
یز پر ہوا تھا۔ چار سال پہلے میں نے اعجاز صاحب کو خط لکھ کر تجویز پیش کی تھی
وہ "شاعر" میں فکر تونسوی کا گوشہ شائع کریں۔ عادت کے مطابق "وہ میری
ا تجویز کا ایک مدیر کی حیثیت سے بہت دنوں تک جائزہ لیتے رہے۔ خطوط
ھ نئے نکات اُٹھائے، نتائج و عواقب پر غور کیا تخمینہ بنایا کہ ادیب کے
ے پر کتنا صرفہ آئے گا۔ کتنے صفحات گوشے کے لئے رکھے جائیں، گوشے
ں کیا کیا ہونا چاہئیے۔ بہت غور و فکر کے بعد وہ فکر تونسوی کا گوشہ شائع کرنے
ے لئے تیار ہو گئے۔ یہ گوشہ پسند کیا گیا تو انھوں نے کئی گوشوں میں "صاحبِ
شہ" کا خاکہ مجھی سے لکھوایا۔ کم از کم پانچ گوشوں میں، میں نے خاکے لکھے۔
ب تک وہ "پلاننگ" نہیں کرتے تھے، تب تک "شاعر" کے تعلق سے کوئی
ملہ نہیں کرتے تھے۔ کم از کم ہندوستان میں اُردو صحافت کو "پلاننگ" سے
شناس کرانے میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا۔ "شاعر" کے کئی ضخیم نمبر اُن کی "پلاننگ
جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ مدیر کی حیثیت سے وہ بڑے سخت مزاج آدمی تھے

جب تک کوئی چیز اُن کے معیار کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی تھی تب تک اُسے اپنے رسالے میں جگہ نہیں دیتے تھے ۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اعجاز صاحب وہ واحد ایڈیٹر تھے جنھوں نے میرے ایک مضمون کو یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ یہ "شاعر" میں نہیں چھپ سکے گا۔ لیکن مضمون کو واپس کرتے وقت کچھ اس طرح کا خط لکھا تھا کہ اُسے پڑھ کر اُن کی رائے سے متفق ہونا پڑا۔

اعجاز صاحب کی ایک ادا مجھے ہمیشہ پسند رہی کہ اتنے اہم ادبی رسالے کے مدیر ہونے کے باوجود انھوں نے اس رسالے کو کبھی اپنی ذاتی شہرت کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے کہ انھوں نے جیتے جی اپنا مجموعہ کلام تک شائع نہیں کیا۔ حالانکہ وہ چاہتے تو اپنے ادارے کی جانب سے ہی اپنا مجموعہ کلام شائع کرا سکتے تھے۔ اُن میں اپنی ذات کے لئے ایک عجیب سی بے نیازی تھی ۔ اُن کی دو ہی کمزوریاں تھیں۔ ایک کمزوری اردو اور دوسری کمزوری شاعر۔ اوّل الذکر کمزوری کو وہ موخر الذکر کمزوری سے زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے۔ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے کہ اردو زبان کا کیا ہوگا۔ ۴۲ سال تک وہ "شاعر" کو نکالتے رہے اور ہر شمارے کا اداریہ انھوں نے "اردو زبان کے مسائل کے لئے وقف کیا۔ میں اکثر مذاق میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ "اردو زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کسمپرسی پر ۴۲ سال سے "شاعر" میں اداریے لکھے جا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ زبان آج

بھی زندہ ہے"

اعجاز صاحب سے بمبئی، حیدرآباد اور دہلی میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور ہر ملاقات کے بعد اُن کی وضعداری، مروت، نیک نفسی اور شرافت کا تاثر اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ اعجاز صاحب آدمی نہیں تھے۔ ایک تہذیب تھے، ایک علامت تھے۔ اب مٹی ایسے انسانوں کو پیدا کرنے سے قاصر ہوتی جارہی ہے۔

اُن کی ذات میں بڑا سلیقہ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ آن سے ۱۰ جنوری ۱۹۷۸ء کو دہلی میں آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آمنہ ابوالحسن کے گھر پہ دوپہر کے کھانے پر مدعو تھے، میں اپنی دفتری مصروفیات کے باعث اس دعوت میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ دوپہر میں ٹھیک ایک بجے میرے دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے اعجاز صاحب بول رہے تھے "بھئی! میں آمنہ کے ہاں سے بول رہا ہوں۔ جب تک آپ نہیں آئیں گے تب تک میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں"

میں نے دفتر کی مجبوریوں کا ذکر کیا۔ پھر فاصلے کا حوالہ دیا کہ اگر میں اپنی گاڑی میں بھی نکلوں تو پہنچنے میں پون گھنٹہ لگ جائے گا۔

بولے: "چاہے دو گھنٹے ہی کیوں نہ لگیں۔ آپ کا آنا نہ صرف ضروری بلکہ اشد ضروری ہے"

میں نے اپنے ذہن میں فوراً اس "اشد ضروری" کے نیچے لال روشنائی سے ایک لکیر کھینچ دی۔ میں جانتا تھا کہ اس "اشد ضروری" کے بعد وہ فون نہیں کریں گے بلکہ ٹیلیگرام کریں گے۔ چار وناچار میں بھاگا بھاگا آمنہ کے

ہاں پہنچا تو وہ میرے منتظر تھے۔ بڑے پیار سے ملے۔ وہ علی گڑھ سے اسی دن واپس ہوئے تھے۔ خلاف توقع اُس دن اُنھوں نے اپنی خرابیٔ صحت کا ذکر نہیں کیا البتہ اردو زبان وادب کے مسائل کا ذکر ضرور کرتے رہے۔ اگرچہ پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ لیکن اُس دن آمنہ کے پکوان کی تعریف کر کے ہر قسم کا کھانا کھاتے رہے، آمنہ کی بچیوں سے کھیلتے رہے۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد جب وہ جانے لگے تو میں انھیں چھوڑنے کے لئے باہر تک گیا۔ پھر پوچھا "اعجاز صاحب! یہ بتایئے آپ کو جانا کہاں ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو کہیں "ڈراپ" کر دوں"۔ بولے "نہیں! یہاں سے میرے اور آپ کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ کوئی تکلیف نہ کیجئے۔ میں اپنے راستے پر چلا جاؤں گا"۔

اور اس کے ٹھیک ایک مہینے بعد اعجاز صاحب سچ مچ ایک ایسے راستے پر چلے گئے جس پر چل کر آدمی کبھی واپس نہیں ہوتا۔ میرا ماتھا تو اُسی وقت ٹھنکا تھا جب اعجاز صاحب نے ڈھائی گھنٹوں کی ملاقات میں ایک بار بھی اپنی خرابیٔ صحت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں اُسی وقت تاڑ گیا تھا کہ اعجاز صاحب کی بیماری اب لفظوں سے آگے نکل گئی ہے جبھی تو وہ اس باب میں چپ سے ہیں ــــــ

اور یوں اُردو صحافت ایک وضعدار ایڈیٹر اور اردو زبان اپنے ایک مجاہد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوئی۔

اگست ۱۹۷۸ء

٭٭٭

مخدوم محی الدین

یادوں میں بسا آدمی

پچیس چھبیس برس اُدھر کی بات ہے۔ مخدوم محی الدین "انڈر گراؤنڈ" تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ اُن دنوں بھی مجھے اتنی ہی انگریزی اور اردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے تئیں "انڈر گراؤنڈ" کا آسان ترجمہ "زیرِ زمین" کر کے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیرِ زمین رہ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو وہ "یکے از معدنیات" قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔ بھلا ایک آدمی کو خواہ مخواہ "زیرِ زمین" جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ترجمے کی یہ غلطی مجھ سے بچپن میں سرزد ہوئی تھی مگر جب بڑے ہوئے تو کہیں پڑھا کہ پاکستان کے ایک شاعر سے ترجمے کی یہ غلطی عین جوانی میں سرزد ہوئی تھی۔ جن دنوں "بنّے بھائی" یعنی سجاد ظہیر پاکستان میں پارٹی کی

سرگرمیوں کے سلسلہ میں روپوش تھے۔ تاجکستان کے مشہور شاعر مرزا ترسون زادہ پاکستان کے دورے پر آئے اور ایک پاکستانی شاعر سے فارسی میں پوچھا "سجاد ظہیر کجا است؟"

پاکستانی شاعر نے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا "سجاد ظہیر زیرِ زمین است" یہ سنتے ہی مرزا ترسون زادہ کی آنکھوں میں کم و بیش اتنی ہی روانی کے ساتھ آنسو آ گئے۔ بولے "یہ کب ہوا؟ ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ آخر انھیں کیا بیماری ہو گئی تھی؟"

پاکستانی شاعر کو اچانک اپنی فارسی دانی کا احساس ہوا تو ہاتھوں اور بھنوؤں کے اشارے سے مابقی فارسی بولتے ہوئے مرزا ترسون زادہ پر "زیرِ زمین" اور "روپوش" ہونے کے نازک فرق کو واضح کیا۔ اسی طرح مخدوم بھی میرے لئے ایک عرصہ تک "زیرِ زمین" ہی رہے اور کسی نے میری غلط فہمی دور نہیں کی۔

پھر جب ہم نے شعور سنبھالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ مخدوم بڑی تیزی سے ہمارے شعور کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ پھر حصہ بنتے بنتے وہ مکمل شعور ہی بن گئے۔ مخدوم سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے ایک دوست مخدوم کے مجموعہ کلام "سرخ سویرا" کو رحل پر رکھ کر نہ صرف پڑھا کرتے تھے بلکہ مطالعے کے دوران میں آگے اور پیچھے جھولتے بھی تھے۔ ہے کوئی شاعر جس کا کلام اس طرح پڑھا گیا ہو؟

صاحبو! وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر صبح بستر سے جاگتے ہی آسمان پر نظر

جاتی تھی کہ کہیں "سرخ سویرا" تو نہیں آگیا۔ جی چاہتا اپنے ملک میں بھی ایک عدد "انقلاب روس" لے آئیں ۔ انقلاب کے انتظار میں سگریٹیں پی پی کر کئی راتیں گزاریں۔ ہمارا سوشلزم وہی تھا جو مخدوم اور فیض کی شاعری، کرشن چندر کے افسانوں سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی تحریروں کے وسیلے سے ہم تک پہنچا تھا۔ گویا یہ خالصتاً اردو سوشلزم تھا۔ مگر ہم حیدرآبادیوں کے لئے مخدوم صرف شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔ مخدوم کی زیر زمین رہنے کی عادت کی وجہ سے آن کی شخصیت کے اطراف ایک عجیب سا سحر پیدا ہو گیا تھا۔ یار لوگوں نے آن کے بارے میں باتیں بھی کچھ ایسی ہی پھیلا رکھی تھیں کہ کبھی کبھی مخدوم ایک مافوق الفطرت شئے دکھائی دیتے تھے، کہا جاتا تھا کہ مخدوم بیک وقت چار مختلف مقامات پر موجود رہتے ہیں۔ اگر چار بجے وارنگل میں مزدوروں کے ایک خفیہ جلسہ سے خطاب کر رہے ہیں تو ٹھیک اسی وقت نلگنڈہ میں ایک زمیندار کی زمین بے زمین کسانوں میں بانٹ رہے ہیں، اور پھر ٹھیک اسی سمے حیدرآباد کے ایک محلہ میں اپنے ایک دوست کو اپنی تازہ نظم سنا رہے ہیں ۔ اور پھر اسی وقت اب خیر جلنے بھی دیجئے ایسی باتیں کہاں تک سنائی جائیں۔ مخدوم کے بارے میں اس قسم کے انکشافات کو سن کر ہمارے کمسن اور نوخیز خون کی جو حالت ہوتی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں، خون رگوں میں آبلا پڑتا تھا جسے بعد میں مخدوم کے کلام کے ذریعے ہی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ علاج بالمثل اسی کو کہتے ہیں۔ اس وقت تک مخدوم کو نہیں دیکھا تھا حالانکہ آن کے ہرچے

(OMNI PRESENT) ہونے کی اتنی ساری افواہیں سن رکھی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ مخدوم جب قید سے رہا ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ وہ شاہ آباد میں مزدوروں کے ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لیئے آرہے ہیں۔ ان دنوں میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ جس شاعر کا کلام اپنے لیئے وظیفہ تھا اور جس کی تصویر سدا دل کے آئینہ میں رکھی رہتی تھی اس کے شاہ آباد آنے کی اطلاع ملی تو رگوں میں خون کچھ اس زور سے ابلا کہ میں اور میرا ایک دوست جو "سرخ سویرا" کو رحل پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا اسٹیشن کی طرف بھاگے معلوم ہوا کہ شاہ آباد جانے والا مدراس میل ابھی جاچکا ہے، انکوائری سے پوچھا کہ شاہ آباد کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے۔ جواب ملا "۲۵ کلو میٹر"۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ آج عشق، آتش نمرود میں کود پڑے گا اور ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرے گا۔ اپنے جنون کی کہاں تک تشہیر کی جائے۔ یہ ہماری زندگی کی پہلی اور آخری لانگ مارچ" تھی۔ مگر شاہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخدوم آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ماتھے پیٹ کر چپ ہو رہے۔ مگر مخدوم مافوق الفطرت تھے تو تھے ہی۔ انہیں غالباً کسی غیبی طاقت نے بتا دیا تھا کہ گلبرگہ میں دو روحیں ان سے ملنے کے لیئے بیتاب ہیں، لہذا پندرہ دن بعد مخدوم گلبرگہ چلے آئے۔ مزدوروں کے کسی جلسے کو مخاطب کرنے چلے کے بعد کالج کے نوجوانوں نے انہیں گھیر لیا۔ مجھے یاد ہے وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ایسا روشن چاند ہم نے زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گلبرگہ کے

مومن پورہ میں ایک بزرگ کے مزار کے سامنے ایک چبوترے پر مخدوم ہم نوجوانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور مخدوم ہم سب کو کلام سنا رہے تھے۔ "سرخ سویرا" تو ہمیں زبانی یاد تھا ہی لہٰذا ہم نے کہا، "مخدوم بھائی اپنا کوئی غیر مطبوعہ کلام سنائیے۔" بولے "میں غیر مطبوعہ کلام نہیں کہتا۔ ہمیشہ مطبوعہ کہتا ہوں۔"

...

پھر میں حیدرآباد آیا۔ مخدوم سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر یوں ہوا کہ کئی برس بعد ایک دن میں، پروفیسر حسن عسکری اور مخدوم حیدرآباد کے دربار ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجھے مخدوم سے ملنے کا وہ پہلا اور انوکھا اشتیاق یاد آیا۔ میں نے مخدوم سے کہا "مخدوم بھائی! آپ کو پتہ نہیں کہ کئی برس پہلے آپ سے ملنے کے لیے میں اور میرے ایک ساتھی نے گلبرگہ سے شاہ آباد تک پیدل سفر کیا تھا۔"

یہ سنتے ہی نہایت رازداری کے انداز میں بولے "اچھا تو اب بولو۔ بتاؤ کیا کام تھا تمہیں مجھ سے؟۔ کوئی خاص بات تھی کیا؟"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "مخدوم بھائی! اب تو مجھے یاد نہیں رہا کہ میں اس وقت آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی باتیں، بہت سی خواہشیں اور بہت سے کام یونہی اوجھل ہو جاتے ہیں۔"

بولے "یاد کر کے بتانا۔ تمہارا حافظہ خاصا کمزور ہو چلا ہے۔ اور ہاں آئندہ کبھی پیدل چلنے کی غلطی نہ کرنا۔" یہ کہہ کر مخدوم نے زوردار قہقہہ لگایا (مجھے آج تک

پتہ نہیں چل سکا کہ مخدوم نے یہ قہقہہ مجھ پر لگایا تھا یا اپنے آپ پر۔ بعض قہقہوں کے مبدا کا سراغ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے)۔ اپنی بات کو ختم کرکے مخدوم نے مجھ سے اور حسن عسکری سے زوردار مصافحے کئے۔ اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے اور مذاق کی کوئی بات کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضرور کرلیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی مخدوم روبرو ہوتے تو میں بائیں ہاتھ سے سگریٹ پیتا تھا اور دائیں ہاتھ کو مصافحے کے لئے ریزرو رکھتا تھا۔ ایک بار مجھے اور مخدوم کو ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لئے بمبئی جانا پڑ گیا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر میں پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا اور دوسرے میں ہولڈول۔ مخدوم نے مجھے دیکھتے ہی مصافحہ والا فقرہ کہہ دیا اور میں نے اٹیچی کیس کو نیچے رکھ کر اُن سے مصافحہ کیا۔ پھر اُنھوں نے تابڑ توڑ کئی بار بامصافحہ فقرے کہہ کر مجھ سے اٹیچی کیس کو نیچے رکھوایا۔ میں اُن کے فقروں سے ایسا الرجک ہوا کہ ابھی وہ آدھا فقرہ ہی کہتے تھے کہ میں اٹیچی کیس کو نیچے رکھ دیتا تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر بولے "بیٹا! اب تو تم میرے ایسے فقروں پر بھی اٹیچی کیس نیچے رکھنے لگے ہو جن پر میں مصافحہ نہیں کرتا۔ تم خود ورزش کرنا چاہتے ہو تو کرو"۔

یہ کہہ کر مجھے اٹیچی کیس نیچے رکھنے کا حکم دیا۔ مصافحہ کیا اور بولے "خبردار جو اب کبھی اٹیچی کیس نیچے رکھا"۔ اور اس کے بعد پھر مصافحے کی منزل آ گئی۔

مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔ اپنا

مذاق آپ اُڑانے میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک بار علی الصبح اورینٹ ہوٹل میں پہنچ کر بیرے سے پوچھا "نہاری ہے؟"

بیرا بولا "نہیں ہے"

مخدوم نے پوچھا "آملیٹ ہے؟"

بیرا بولا "نہیں ہے"

مخدوم نے پوچھا "کھانے کے لئے کچھ ہے؟"

بیرا بولا "اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے"

اس پر مخدوم بولے "یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے"

اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تو اُسے سنانے کے لئے دوڑ پڑتے تھے۔ اپنی اس عادت سے متعلق خود ہی ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے۔ ایک دن اُن سے غزل ہو گئی تو فوراً اورینٹ ہوٹل چلے آئے کہ کوئی مائی کا لال مل جائے تو اُسے غزل سنائیں۔ یہاں کوئی نہ ملا تو "صبا" کے دفتر چلے گئے۔ وہاں بھی کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کے چائنیز بار میں چلے گئے۔ بار کے بیرے قاسم کو بلا کر کہا "دو پیگ وہسکی لے آؤ"۔ قاسم وہسکی لے آیا تو اُس سے بولے "بیٹھو اور وہسکی پیو"

قاسم شرماتا رہا مگر وہ مصر رہے۔ اُس نے کھڑے کھڑے وہسکی پی لی۔ پھر بولے "دو پیگ وہسکی اور لے آؤ"۔ دوسرے دور میں بھی انھوں نے قاسم کو وہسکی پلائی پھر تیسرا دور چلا۔ اس کے بعد مخدوم نے قاسم سے کہا۔

"اچھا قاسم اب میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمہیں اپنی تازہ غزل کے کچھ شعر

سُنانا چاہتا ہوں"! یہ سنتے ہی قاسم نے کہا "صاحب! آپ بہت پی چکے ہیں۔
آپ کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ چلئے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں"!

مخدوم کہا کرتے تھے کہ اپنی ہوشمندی کے ہزار ثبوت پیش کرنے کے باوجود
قاسم نے اس رات ان کی غزل نہیں سُنی یہ لطیفہ سُنا کر خود ہی ہنستے تھے اور
مخاطب سے زوردار مصافحہ کرتے تھے۔

یہ لطیفہ بھی مخدوم ہی سُنایا کرتے تھے جو اُن کے دور روپوشی سے
متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار یہ اپنے ایک برہمن دوست کے گھر روپوش
ہو گئے۔ ان کا برہمن دوست بھی پارٹی کا ممبر تھا۔ اُن کے دوست نے ان
سے کہہ رکھا تھا کہ "مخدوم بھائی میرے والد بڑے قدامت پرست ہیں۔
اسی لئے ان پر کبھی یہ ظاہر نہ کرنا کہ آپ براہمن نہیں ہیں۔ اپنی برہمنیت کی
لاج رکھنا"۔

ایک دن اُن کے دوست کے والد نے مخدوم سے کہا "بھئی! تم لوگ
کمیونسٹ پارٹی میں ہو۔ تمہارے دھرم کا کوئی بھروسہ نہیں کہیں تم گوشت
تو نہیں کھاتے؟"

مخدوم نے جھٹ سے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ
میں گوشت کھاتا ہوں۔ نعوذ باللہ یہ تو مجھ پر سراسر تہمت ہے"!

اس نان ویجیٹیرین جملے کے بعد اُن کی روپوشی کا کیا بنا اس کے بارے
میں مخدوم کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ جہاں خوش مذاقی اور شگفتہ مزاجی کا پیکر

نظریاتی عقیدے کے معاملے میں بے حد سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ وہ ہنستے کھیلتے سیٹی بجاتے خوش خوش اوریئنٹ ہوٹل آتے مگر ٹیبل پر بحث کے بعد جب جانے لگتے تو مٹھیاں بھنچی ہوتی تھیں، منہ سے کف نکل رہا ہوتا تھا اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے مخدوم بہت احتیاط سے برتنے کی چیز تھے۔ ذرا کوئی چوک گیا اور مخدوم کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

اُن کے انتقال سے دو برس پہلے کی بات ہے۔ حیدرآباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ برپا تھا۔ مخدوم ڈائس پر بیٹھے تھے اور ایک شاعرہ مائک پر کلام سُنا رہی تھیں۔ ڈائس کے نیچے ایک لحیم شحیم شخص نشہ میں دھت بیٹھا شاعرہ کو گھورے جا رہا تھا۔ پھر اُس کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اُس نے اچانک شاعرہ کی طرف چھلانگ لگائی۔ مخدوم نے بھی چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اُس شخص کی طرف چھلانگ لگائی۔ سیکنڈوں میں اُس شخص کو ڈائس سے نیچے گرایا اور اُس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ میں کیسے بتاؤں کہ بیس پچیس برس بعد مخدوم کے اندر چھپے ہوئے انقلابی کو پھر ایک بار سرگرمِ عمل دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی۔ لوگوں نے مخدوم کی اس ادا کی داد بھی اُسی طرح دی جس طرح اُن کے کلام پر دیا کرتے تھے۔

وہ چھوٹوں کے ساتھ بہت شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ حیدرآباد کے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت انھوں نے کی سلیمان اریب عزیز قیسی، اقبال متین۔ وحید اختر۔ جیلانی بانو، انور معظم، آمنہ ابوالحسن، شاذ تمکنت۔ عاتق شاہ، عوض سعید اور مغنی تبسم یہ سب مخدوم سے متاثر تھے۔

وہ میری بھی ہر قدم پر ہمت افزائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجھے "مسخرا" کہہ کر پکارتے تھے۔ اب اس سے زیادہ کوئی میری ہمت افزائی کر کے دکھا دے۔ اُردو کے مسخروں یعنی مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی تو اس کا افتتاح انھوں نے ہی فرمایا۔ میرے مضامین کے پہلے مجموعے کی رسمِ اجرا بھی انھوں نے ہی ازراہِ تمسخر انجام دی تھی۔

ادیبوں سے وہ اُلجھتے بھی تھے۔ اس معاملے میں وحید اختر پر اُن کی بڑی نظرِ عنایت رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی دوستوں کو جان بوجھ کر چھیڑتے بھی تھے ایک رات سلیمان اریب کے گھر پر حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد سے کہا "شاعری، مصوری سے کہیں زیادہ طاقتور میڈیم ہے"۔

سعید بن محمد نے برجستہ بکف جواب دیا "مصوری اور شاعری کا کیا تقابل۔ شاعری میں تم جو چیز بیان نہیں کر سکتے ہم رنگوں اور فارم میں بیان کر دیتے ہیں۔ تم کہو تو میں ساری اُردو شاعری کو پینٹ کر کے رکھ دوں"۔

مخدوم بولے "ساری اُردو شاعری تو بہت بڑی بات ہے۔ تم اس معمولی مصرعے کو ہی پینٹ کر کے دکھا دو ؎

"پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے"

سعید بن محمد بولے "یہ کونسی مشکل بات ہے۔ میں کینوس پر گلاب کی ایک پنکھڑی بنا دوں گا"۔

بولے "پنکھڑی گلاب کی تو پینٹ ہو گئی مگر "سی" کو کیسے پینٹ کرو گے؟"

سعید بن محمد بولے "سی" بھی بھلا کوئی بینیٹ کرنے کی چیز ہے۔"
مخدوم بولے "مصرعے کی جان تو "سی" ہی ہے، سعید آج میں تمھیں جانے نہیں دوں گا جب تک تم "سی" کو بینیٹ نہیں کرو گے۔"
یہ سنتے ہی سعید بن محمد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مجھے اس وقت مخدوم کا وہ مضمون یاد آرہا ہے جو انھوں نے حیدرآباد کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بہ زبان انگریزی "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" میں لکھا تھا۔ مضمون کا چونکہ پہلے سے اعلان ہوچکا تھا اس لئے جس دن ویکلی کا شمارہ حیدرآباد پہنچا اردو ادیبوں اور شاعروں نے دھڑا دھڑ اس کی کاپیاں خرید لیں۔ نیوز پیپر اسٹال والا سخت حیران کہ اردو شاعروں کو آج کیا ہوگیا کہ انگریزی کا رسالہ خریدے چلے جارہے ہیں۔ میں عابد روڈ سے گزر رہا تھا کہ حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر ویکلی کا شمارہ ہاتھ میں پکڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "بھئی! اس میں مخدوم کا مضمون کہاں ہے بتاؤ؟"
میں نے مخدوم کا مضمون نکال کر بتایا تو بولے "اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس میں میرا نام کہاں ہے؟" پہلے تو میں بڑی دیر تک اپنا نام مضمون میں تلاش کرتا رہا۔ یہ نہ ملا تو شاعر موصوف کا نام تلاش کرنے لگا۔ حسب توقع یہ بھی وہاں موجود نہ تھا۔ مگر اسی بیچ مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سلیمان اریب کے نام کے نیچے ایک لکیر کھینچتے ہوئے شاعر موصوف سے کہا "لیجئے قبلہ! یہ رہا آپ کا نام۔"
شاعر موصوف ویکلی کے شمارے کو سینے سے لگائے خوش خوش

چلے گئے! تھوڑی دور جانے کے بعد مخدوم اُنھیں مل گئے تو انھوں نے بڑی احسان مندی کے ساتھ مضمون میں اُن کا نام شامل رکھنے کا شکریہ ادا کیا۔

مخدوم نے کہا "قبلہ! آپ کو کس نے بتایا کہ آپ کا نام مضمون میں شامل ہے"

وہ بولے "ابھی ابھی مجتبیٰ نے مجھے بتایا ہے"

مخدوم بولے "مولانا! مجتبیٰ کو بھی اُتنی ہی انگریزی آتی ہے جتنی کہ آپ کو آتی ہے۔ جانے دیجیے۔ آپ کا نام میں نے نہیں لکھا ہے"

اس مضمون کے بعد حیدرآباد کے کئی نوجوان ادیبوں کو مخدوم سے شکایت ہوگئی۔ ایک دن اورینٹ ہوٹل میں یہی مضمون زیرِ بحث تھا۔ مخدوم بولے بھئی! ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیئے اُس کا نام یا کلام کہیں چھپے یا نہ چھپے اُسے تو بے تعلق رہنا چاہیئے" اس کے بعد بحث ختم ہوگئی اور دوسرے مسائل زیرِ بحث آ گئے۔ مگر اسی بیچ مجھے پھر ایک شرارت سوجھی، میں نے بالکل ہی بے نیاز ہو کر کہا "مخدوم بھائی! آپ کی ایک نظم دلّی کے ایک رسالے کے تازہ شمارے میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے"

پوچھا "کونسے رسالے میں؟"

میں نے کہا "مجھے نام تو یاد نہیں مگر عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی میں یہ رسالہ دیکھ کر آرہا ہوں"

مخدوم تھوڑی دیر تو انجان اور بے تعلق بنے رہے۔ پھر اچانک کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ اُن کی عادت تھی۔ پھر بولے "اچھا اب چلتے

ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

میرے ساتھ کچھ احباب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا" مخدوم بھائی یہاں سے سیدھے بک اسٹال پر جائیں گے۔ چلو ہم بھی چلیں"۔

ہم لوگ بک اسٹال پر پہنچے تو مخدوم سچ مچ وہاں موجود تھے اور رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جونہی ہم پر اُن کی نظر پڑی، اُنھوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے "کیوں بے مسخرے۔ ہم سے بدمعاشی کرتا ہے"۔

میں نے کہا" مخدوم بھائی میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے"۔

مخدوم کو حیدرآباد سے بے پناہ پیار تھا۔ جسے وہ ہمیشہ "وطن مالوف" کہا کرتے تھے۔ حیدرآباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدرآباد کے اندر۔ حیدرآباد کی گلی گلی میں اُن کے چرچے تھے۔ حیدرآبادیوں نے اُنھیں ٹوٹ کر چاہا بھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے تو اپنے گھر کا نام ہی "چنبیلی کا منڈوا" رکھ چھوڑا تھا جو مخدوم کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے۔ لوگ اپنے گھروں کے نام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ نے اپنے گھر کا عنوان رکھا تھا۔ اگرچہ اپنے گھر میں معنویت پیدا کرنے کے لئے چنبیلی کی بیل بھی لگا رکھی تھی مگر اب بھی اُن کے گھر میں "چنبیلی کا منڈوا" کم اور مخدوم کی نظم زیادہ نظر آتی ہے۔

وہ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ سارا دن پارٹی کا کام کرتے اور شام کو

تھوڑا سا وقت دوستوں میں گزارتے تھے۔ جہاں احساس ہوا کہ وقت ضائع ہو رہا ہے جھٹ سے اُٹھ جاتے تھے اور محفل سے غائب۔ وہ دنیا سے گئے بھی اسی طرح یعنی ایک دن جھٹ سے چلے گئے۔

آخری مرتبہ جب وہ دہلی جا رہے تھے تو مجھ سے روزنامہ "سیاست" کے دفتر پہ ملے۔ میں نے پوچھا "مخدوم بھائی! واپسی کب ہوگی؟" بولے "یہی دو چار دن میں آ جاؤں گا"۔ وہ بات کے بڑے پکے تھے۔ لہٰذا حیدرآباد واپس آئے مگر کچھ اس شان کے ساتھ کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے کندھوں پر سوار تھے سیاسی کامرانیوں کے بعد مخدوم کا ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہونا یا مخدوم کے کندھے پر ڈاکٹر گوڑ کا سوار ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی مگر اس بار وہ ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہوئے تو نیچے نہیں اُترے ہمیشہ کے لئے سب کے دلوں میں ایک زخم بن کر آنز گئے۔ مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایسا جنازہ کسی شاعر اور وہ بھی اردو شاعر کو بھلا کہاں نصیب ہوگا۔ اور یوں وہ پھر "زیر زمین" چلے گئے مگر اس بار وہ "زیر زمین" جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے۔ اپنا سب کچھ دنیا کو سونپ گئے۔ اپنی شاعری، اپنا عقیدہ، اپنی باتیں، اپنے لطیفے، اپنی یادیں غرض سب کچھ ۔۔۔

مخدوم کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مخدوم ایک انسان نہیں تھے۔ جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی۔ ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔

مخدوم کے انتقال کے بعد پہلی بار احساس ہوا کہ "غریب الوطنی" کس کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں، کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔

(مئی ۱۹۷۸ء)

کرشن چندر کے بغیر اردو ادب پر سے پورا ایک سال بیت گیا۔ وقت بھلا کبھی رکتا ہے۔ کرشن جی کی وہ معصوم مسکراہٹ جو اُن کی کہانیوں کی طرح اُنہی کا حصّہ تھی پچھلے سال کہیں نہیں دکھائی دی۔ اُن کی پہلی برسی پر کتنی ہی یادیں ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں۔ وہ اتنے بڑے ادیب تھے لیکن عملی زندگی میں کسر نفسی اور انکساری کا پیکر تھے۔ اُن کی انکساری میں ایک عجیب سا شرمیلا پن تھا۔ ہر کام کرنے سے پہلے شرماتے تھے۔ کوئی اُن کی تعریف کرتا تو شرماتے تھے۔ چھوٹوں سے ملتے تو شرماتے تھے، بڑوں سے ملتے تو تب بھی شرماتے تھے۔

اُن کے ایک ہاتھ پر انگریزی میں اُن کا نام بڑے حروف میں گدا ہوا تھا "KRISHAN CHANDER"۔ میں نے ایک بار مذاق میں اُن سے کہا تھا ـــــ

"کرشن بھائی! یہ آپ نے اپنے ہاتھ کو وزیٹنگ کارڈ کیوں بنا رکھا ہے۔
اور پھر یہ بتائیے کہ جب آپ کا ایک ہاتھ مطبوعہ ہے تو دوسرے ہاتھ کو
کیوں غیر مطبوعہ رکھا ہے؟ اس پر بھی کچھ لکھیے بلکہ اردو میں لکھیے کیونکہ آپ تو اردو
کے ادیب ہیں۔ آپ کے ہاتھ پر اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہیے" میری بات
کو سن کر پہلے تو زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر گمبھیر ہو کر بولے "ہاتھ پر انگریزی میں نام
لکھا ہو تو کیا ہوتا ہے۔ میرا ماتھا تو اردو لکھتا ہے" ـــــ اردو کے معاملہ
میں وہ فوراً گمبھیر ہو جایا کرتے تھے۔

ان کے اس "دستی وزیٹنگ کارڈ" کی وجہ سے ایک زوردار لطیفہ بھی ہوا تھا
وہ جب دہلی آتے تو نظام الدین کے ہوٹل راج دوت میں ٹھہرتے۔ ایک رات
میں اور کرشن جی ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو دیکھا کہ نئی نسل کے کچھ نوجوان
کاؤنٹر پہ بکھرے شراب نوشی میں مصروف ہیں، نوجوان نشے میں دھت تھے
کرشن جی کاؤنٹر پہ پہنچے تو ایک نوجوان نے قدرے جھک کر ان کے ہاتھ پر لکھا
ہوا نام پڑھا اور پھر اپنے دوساتھیوں سے سرگوشی کے انداز میں بولا "یار سنو!
ایک کرشن چندر تو وہ ہے جس نے گدھے کی آتم کتھا (سرگزشت) لکھی ہے اور
ہمارے درمیان اس وقت ایک ایسا کرشن چندر آیا ہے جو اس "آتم کتھا" کا ہیرو
ہے" نشہ میں سرگوشی بھی کافی بلند ہو جاتی ہے۔ کرشن جی نے جیسے ہی یہ جملہ سنا
بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ پیار سے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ نوجوان
کے اس جملے سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جی میں آئی کہ اس نوجوان

کو اُن کی بدتمیزی کا احساس دلایا جائے. مگر جب کرشن جی نے ہی اپنا دوسرا گال بھی ظالم کے آگے پیش کر دیا تو بھلا میں کیا کر سکتا تھا. تاہم میں نے نوجوان سے کہا "برخوردار! تمھیں جس کرشن چندر کا انتظار ہے وہ ابھی پیدا نہیں ہوا ہے. فی الحال تمھارے سامنے وہی کرشن چندر ہیں جنھوں نے گدھے کی آتم کتھا لکھی ہے"۔ نوجوان نشے میں تو تھا ہی یہ سنتے ہی احساس ندامت کے مارے کرشن جی کے قدموں میں جھک گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھی بھی کرشن جی کے قدم چھونے لگے۔ اُن کے منع کرنے کے باوجود یہ نوجوان نہ صرف اُن کے پیر چھونے میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک غیر متعلق شرابی وہاں سے گزرا تو وہ بھی بلا سوچے سمجھے کرشن جی کے قدموں میں جھک گیا. جب چرن چھو چکا تو ایک ہچکی لے کر بولا "آخر معاملہ کیا ہے؟ ان کے چرن کیوں چھوئے جا رہے ہیں؟ کیا یہ کوئی مہاتما ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں! مہاتما ہیں سچ مچ مہاتما. تم کیا جانو کہ یہ کیا ہیں؟"۔

اس پہ وہ پھر ایک بار کرشن جی کے چرنوں میں جھک گیا اور کرشن جی ان شرابیوں کی حرکتوں پر مسکراتے رہے۔ وہ غصہ کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ نہ جانے اُن کے پاس پیار کی اتنی ساری دولت کہاں سے آ گئی تھی۔ ہر ایک کی جھولی اپنے پیار سے بھر دیتے تھے۔

کھانے کے وہ بڑے شوقین تھے چٹپٹی چیزیں تو بہت شوق سے کھاتے تھے ۱۹۶۸ء کی بات ہے. اُن کے قلب پر پہلے حملے کے بعد ڈاکٹر نے انھیں مصالحہ دار اور چکنی چیزیں کھانے سے منع کر دیا تھا. سلمیٰ آپا (سلمیٰ صدیقی)

اُن پر کڑی نگرانی رکھنی تھیں کہ یہ کہیں کچھ کھا نہ لیں۔ اُن دنوں وہ کھار کے "گرونواس" والے مکان میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر نے انھیں چہل قدمی کرنے کی اجازت دیدی تھی۔

میں اُن سے ملنے پہنچا تو سلمیٰ آپا سے اجازت لے کر میرے ساتھ چہل قدمی کے ارادے سے سڑک پر نکلے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ ایک آدھ فرلانگ کی چہل قدمی کے بعد واپس آئیں گے۔ اپنے گھر کے سامنے کی ساری سڑک عبور کی۔ دوسری سڑک پر مڑ کر دور تک دیکھا۔ اپنی جیب میں کچھ تلاش کیا۔ پھر مجھ سے بولے "تمہارے پاس ایک روپیہ ہے؟" میں نے کہا کرشن جی! بھلا ایک روپیہ کی کیا بات ہے"۔ یہ سنتے ہی اپنی چہل قدمی کو تیز کر کے سڑک پر کھڑے ہوئے ایک ٹھیلے کے پاس پہنچے جہاں گرم گرم پکوڑے تل کر بیچے جا رہے تھے اور انہوں نے مشین کی سی تیزی کے ساتھ پکوڑے کھانے شروع کر دیئے۔ اُس وقت اُن کے چہرے پر عجیب و غریب معصومیت کھیل رہی تھی۔ میں نے ایسی معصومیت کسی بڑے ادیب کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی۔ جب کھا چکے تو مجھ سے کہا "تم بھی کھانا چاہو تو کھا لینا۔ بہت اچھے بنے ہیں"۔ مجھے اُن کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ واپسی پر بولے "خبردار! سلمیٰ کو نہیں بتانا۔ یہ عورتیں تو یونہی پریشان رہتی ہیں۔ اور ہاں بمبئی میں کتنے دن ٹھہرو گے؟ جب تک رہو شام میں چہل قدمی کے لئے یہاں چلے آنا"۔

مہمان نوازی اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ کوئی ملنے جاتا تو اُس کے سامنے پھلوں کی پلیٹ رکھ کر خود پھلوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ سیب ایسی نفاست سے کاٹتے تھے کہ ایک جگہ چاقو لگا دیتے تو سارے چھلکے کو یک

جنبشِ قلم" اُتار دیتے تھے۔ اُن کو سیب کاٹتے دیکھنا بھی ایک انوکھی مسرت تھی۔ وہ ایک سیب کاٹ لیتے تو جی کہنے کو چاہتا تھا: "سبحان اللہ! مرحبا! مکرر ارشاد ہوا کیا فصاحت ہے! کیا بلاغت ہے!"

طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کرشن جی کا رتبہ بہت بلند تھا، اس لئے زندگی میں کہیں بھی کوئی مزاحیہ صورتِ حال دکھائی دیتی تو وہ اس میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے ۱۹۶۶ء میں جب وہ مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے حیدرآباد آئے تو ہم لوگوں نے عملی مذاق کے طور پر سوچا کہ انھیں حیدرآباد کے مشہور مزاح نگار حمایت اللہ کی "مزاحیہ موٹر" میں بٹھایا جائے۔ اس پچاس سال پرانی مزاحیہ موٹر کی خوبی یہ تھی کہ اس کی کوئی چھت نہیں تھی۔ پہیے البتہ تھے۔ سیٹیں بھی کہیں تھیں اور کہیں نہیں تھیں۔ اس موٹر کو بیک وقت تین چار ڈرائیور مل کر چلاتے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بریک ہوتا، دوسرے کے ہاتھ میں اسٹیرنگ وہیل، تیسرے کے پاؤں میں ایکسلریٹر اور چوتھے کے ہاتھ میں ہارن۔ میں نے کرشن جی سے کہا "کرشن جی! ہم ایشیا کے عظیم افسانہ نگار کو ایشیا کی سب سے گھٹیا موٹر میں بٹھا کر جلسہ گاہ میں پہنچانا چاہتے ہیں"۔ ہنس کر بولے اس موٹر کے وسیلے سے اگر تم لوگ مجھے ایشیا کا عظیم افسانہ نگار منانا چاہتے ہو تو چلو یہ خطرہ بھی مول لیتے ہیں"۔ کرشن جی، سلمیٰ صدیقی اور یوسف ناظم اس موٹر میں بیٹھ گئے۔ باقی جتنے لوگ تھے وہ سب کے سب ڈرائیور بن گئے۔ کوئی ڈپٹی ڈرائیور تھا، کوئی اسسٹنٹ ڈرائیور تھا۔ اور ایک تو "مہا چالک" بھی تھا۔

کرشن جی اس موڑ میں بیٹھ کر اتنے خوش ہوئے کہ کتنی دیر تک اُن کے چہرے پر یہ خوشی دمکتی رہی۔

کرشن جی آخری زمانہ میں دہلی آنے سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ کہتے تھے ایک بار آیا تو بھانجہ ایک حادثے میں چل بسا، دوسری بار آیا تو ہمندر ناتھ گزر گئے۔ تیسری بار آیا تو سرلا دیوی چلی گئیں۔ آخری مرتبہ وہ جولائی ۱۹۷۶ء میں ایک ہفتہ کے لئے دہلی آئے تھے۔ یوں تو روز ہی ملتے تھے لیکن ۶ جولائی کو دوپہر میں مجھ سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آج تم میری طرف سے اپنے دوستوں کو "راج دوت" پر رات کے کھانے پر بلاؤ" وقت بہت کم تھا۔ میں، فکر تونسوی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اُن کے پاس پہنچے، اُن کے چھوٹے بھائی اوم جی بھی تھے۔ بس یہی اُن سے آخری ملاقات تھی۔ تب پر دو شدید حملوں کے باوجود وہ زندگی سے سرشار تھے۔ اُن کا ارادہ ایک انگریزی رسالہ نکالنے کا تھا۔ کہتے تھے میں تم لوگوں کی چیزیں انگریزی میں چھاپوں گا۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں جب اُن کے قلب پر چوتھا حملہ ہوا اُس سے ایک ہفتہ پہلے اُن کا ایک خط ملا تھا۔ قلب پر پے بہ پے حملوں کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ اُن میں جینے کا کتنا حوصلہ تھا۔ ہم نے ایسے ادیب بھی دیکھے ہیں جنھیں چھینک بھی آتی ہے تو وصیت نامے لکھنے کو دوڑتے ہیں۔ احباب کو جمع کرتے ہیں۔ بیویوں کی چوڑیوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خود اپنے تعزیتی جلسوں کا خاکہ تیار کرواتے ہیں۔

کرشن جی نے آخری سانس تک پرانے دوستوں سے کبھی موت کی بات نہیں کی۔ اُنھیں اپنی موت کی بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ کرشن جی نے اپنے قلم کے ذریعہ سدا زندہ رہنے کا اہتمام کر لیا تھا۔ وہ کرشن چندر جو ہمارا شعور ہے، ہمارا ذہن ہے اور کرشن چندر کا وہ بانکپن جو ہندوستانی ادب کا حصہ بن چکا ہے بھلا کہیں مر سکتا ہے۔

کرشن جی نہ صرف آنے والے برسوں میں بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی زندہ رہیں گے، وہ اب ہمارے ادب کے اُفق پر ایک قوسِ قزح کی طرح تن گئے ہیں اور اس قوسِ قزح کے نیچے سے ادب کے کارواں گزرتے رہیں گے۔

(مارچ ۱۹۷۸ء)

○

سجاد ظہیر

مسکراہٹوں کا آدمی

جب میں چھوٹا تھا تو میرے دو بڑے بھائی ابراہیم جلیس اور محبوب حسین جگر کسی "بنّے بھائی" کے بارے میں آپس میں اکثر بات چیت کیا کرتے تھے۔ "بنّے بھائی یہ کر رہے ہیں، بنّے بھائی وہ کر رہے ہیں۔ بنّے بھائی ایسے ہیں، بنّے بھائی ویسے ہیں" ـــــــ اور میں سوچتا کہ یہ بنّے بھائی بھی بڑے عجیب و غریب بھائی ہیں کہ خاندان میں ان کا اتنا ذکر ہوتا ہے لیکن یہ خاندان سے اتنے بے تعلق رہتے ہیں کہ کبھی پلٹ کر نہیں پوچھتے کہ ہم لوگ کس حال میں ہیں؟

پھر جب میں نے ذرا ہوش سنبھالا تو پتہ چلا کہ یہ بنّے بھائی اصل میں ادب کے بنّے بھائی ہیں۔ سیاست اور سماج میں "بھائی بندی" کا رونا تو ایک معمول ہے۔ لیکن ادب میں یہ انوکھی بات تھی۔ میرا خیال ہے کہ اردو زبان کے سوائے

دنیا کی کسی اور زبان کو "بنے بھائی" کی طرح ایسا "بھائی" نصیب نہ ہو سکا جو سارے ادیبوں کو ایک ہی خاندان کا فرد سمجھتا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں بنے بھائی، فیض، مخدوم، سردار جعفری اور کرشن چندر کی تحریروں نے ہم سب پر کچھ ایسا جادو کیا تھا کہ ہم ہر دم "انقلاب" کی آمد کے منتظر رہتے۔ ایک ایسی سرشاری تھی کہ دروازے پر کوئی دستک بھی دیتا تو گمان ہوتا تھا کہ یہ دستک انقلاب کی ہے۔

ع بتیاں کھڑکیں تو یہ سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے

انقلاب کو دیکھنے کی آس میں ہم لوگ علی الصباح نیند سے بیدار ہو جایا کرتے تھے۔ برسوں اسی بے چینی اور انتظار میں گذر گئے انقلاب تو نہ آیا البتہ علی الصباح بیدار ہونے کی عادت پڑ گئی۔

بنے بھائی کے بارے میں اتنا کچھ پڑھ رکھا تھا کہ انھیں دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ انھیں پہلے پہل حیدرآباد کے ایک ادبی جلسے میں دیکھا۔ جب تقریر کے لئے ان کا نام پکارا گیا تو وہ حاضرین کی سامنے والی قطار میں سے اُٹھ کر یوں سبک خرامی کے ساتھ مائیک پر آئے کہ انھیں دیکھنے کی ساری آرزو کا ستیاناس ہو گیا۔ اُن کے چلنے کے انداز میں ایسی نرمی، آہستگی، ٹھہراؤ اور دھیما پن تھا کہ یکبارگی مجھے یہ وجہ سمجھ میں آگئی کہ ہمارے ملک میں انقلاب کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ انقلابی کا تصور ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ آسے سراسر آگ، سراسر شعلہ، سراسر حرکت اور سراسر تیزی ہونا چاہیئے۔ یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی بنے بھائی ہیں

جن سے حکومت خائف ہے۔ پھر حکومت پر بھی ترس آیا کہ یہ کیسی کیسی معصوم اور بے ضرر شخصیتوں سے خوف زدہ رہتی ہے۔

اُس دن بنّے بھائی نے کیا تقریر کی یہ مجھے یاد نہیں۔ کیوں کہ ان کی تقریر بھی ان کی چال کی طرح تھی۔ رُکتی ٹھہرتی اور سنبھلتی ہوئی۔ مگر رُکنے، ٹھہرنے اور سنبھلنے کے دوران میں جب جب بنّے بھائی مسکرا دیتے تھے تو ان کی تقریر میں بڑی جان پیدا ہو جاتی تھی۔ اُس دن پہلی بار احساس ہوا کہ بعض مسکراہٹیں اپنے اندر تحریر و تقریر سے کہیں زیادہ اظہار کی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ بنّے بھائی کی مسکراہٹ میں اتنی زبردست قوت گویائی تھی کہ وہ صرف مسکرا دیتے تو لفظ و معنی کے دفتر کھل جاتے تھے۔ مسکراہٹ کیا تھی اچھی خاصی ڈکشنری تھی۔ یہ مسکراہٹ بجائے خود ایک زبان تھی۔ ایک رسم الخط تھی۔ اس مسکراہٹ کے رسم الخط کو صرف وہی لوگ پڑھ سکتے تھے جو لطیف جذبوں کا کاروبار کرنا جانتے ہیں۔

مونالیزا کی شہرۂ آفاق مسکراہٹ کے بعد اگر کسی مسکراہٹ نے مجھے مسحور کیا تو یہ بنّے بھائی کی مسکراہٹ تھی۔ ان دونوں مسکراہٹوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ لیونارڈو ڈاونسی نے مونالیزا کی مسکراہٹ کو کینوس پر قید کر دیا تھا جبکہ بنّے بھائی کی مسکراہٹ پھیل کر ایک عقیدہ، ایک نظریہ اور ایک تحریک بن گئی۔ اور پھر یہ مسکراہٹ ہمارے ادب، ہمارے ذہن، ہمارے احساس اور ہماری فکر کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی۔ مجھے تو بعض اوقات پوری ترقی پسند تحریک کے پیچھے بنّے بھائی کی مسکراہٹ کی کارفرمائی جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

سبتنے بھائی بہت بڑے ادیب تھے لیکن اُن کی مسکراہٹ آن کے ادیب سے بھی بڑی تھی۔ اگر اُن کے پاس دلوں میں اُتر جانے والی مسکراہٹ نہ ہوتی تو شاید سبتنے بھائی اتنی بڑی تحریک نہ چلاتے۔

سبتنے بھائی کی مسکراہٹ کی خوبی یہ تھی کہ اس کے بے شمار پہلو اور بے شمار رنگ تھے۔ ایسا تنوّع تھا کہ ہر بار آن کی مسکراہٹ، پچھلی مسکراہٹوں سے الگ معلوم ہوتی تھی۔ کبھی یہ مسکراہٹ معصومیت کا لباس پہن لیتی، کبھی یہ سراسر شفقت بن جاتی۔ کبھی محبت، کبھی عزم، کبھی حوصلہ، کبھی نرمی، کبھی شائستگی، کبھی عقیدہ، کبھی طنز اور کبھی کبھی تو یہ مسکراہٹ سراسر درد و کرب تک کا روپ دھارن کر لیتی تھی۔ سبتنے بھائی کی مسکراہٹ کے کتنے روپ گناؤں؟

میں اکثر مذاق میں کہا کرتا سبتنے بھائی کی مسکراہٹ کبھی خالص نہیں ہوتی۔ اس میں ہمیشہ کسی نہ کسی جذبے کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سبتنے بھائی کم بولتے ہیں مگر اُن کی مُسکراہٹ زیادہ بولتی ہے۔ اسی مسکراہٹ کے دھاگے سے بندھ کر میں سبتنے بھائی سے قریب ہوا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں میں اُن سے پہلی بار ملا تھا۔ چھوٹوں کی ہمت افزائی کے لئے ان کے پاس ایک الگ سی مسکراہٹ ہوتی تھی۔ یہ مسکراہٹ اُس فرق کو پاٹ دیتی تھی جو ان کے اور چھوٹوں کے درمیان ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس مسکراہٹ کے ذریعے میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ وہ مجھے اتنا عزیز رکھتے تھے کہ لگتا تھا وہ شاید کسی اور کو اتنا عزیز نہ رکھتے ہوں۔ مگر بات ایسی نہیں تھی۔ وہ عزیز رکھنے کے معاملے میں بھی

مساوات کے قائل تھے۔ لیکن ہر شخص کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بنّے بھائی اُسے سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

پھر میرے بچپن کے دوست علی باقر جب اُن کے داماد بنے تو ان کی ہمت افزائی والی مسکراہٹ میں میرے لئے کچھ اور گہرائی آگئی۔ مجھے یاد ہے ایک بار بنّے بھائی حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ علی باقر کو ایک جلسے میں مضمون پڑھنا تھا۔ جلسے کے کنوینر کی حیثیت سے مجھے علی باقر کا تعارف کرانا تھا۔ میں نے علی باقر کے تعارف کے سلسلے میں اور بہت سی باتیں کہنے کے علاوہ یہ بھی کہہ دیا کہ "علی باقر کا ایک تعارف یہ بھی ہے کہ یہ ہم سب کے بنّے بھائی کے داماد ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُن کے بنّے بھائی کے داماد بننے کی وجہ سے بنّے بھائی کی شہرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

اس جملے پر لوگوں کو ہنسنا تو تھا ہی لیکن بنّے بھائی کچھ اس طرح مسکرائے کہ یوں لگا جیسے آسمان پر قوسِ قزح سی تن گئی ہو۔

۱۹۷۲ء میں جب میں دہلی آیا تو بنّے بھائی کو اور بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی ادبی جلسوں میں یوں بھی ہوتا کہ بعض نوجوان ادیب اُن پر سخت اعتراضات کرتے، شدید حملے کرتے مگر بنّے بھائی ہر اعتراض کو اپنی مسکراہٹ کے ساتھ سُنتے اور پھر اسی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا جواب بھی دیتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ بنّے بھائی کو شاید ہی کسی نے غصّہ کی حالت میں دیکھا ہو۔ وہ غصّہ کرنے کے گُر سے واقف ہی نہ تھے۔ ذرا سوچئے کہ وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم تھے۔ کیونکہ

ایک انقلابی کے لئے غصہ کے بغیر زندگی کو برتنا ایسا ہی تھا جیسے ایک بھوکے شیر کے سامنے ایک نہتے آدمی کو چھوڑنا۔ لیکن اس کے باوجود بنے بھائی بھوکے شیروں کو قابو میں کر لیتے تھے۔

۱۹۷۲ء کی سردیوں میں ایک بار انھوں نے مجھے اور آمنہ ابوالحسن کو اپنے ہاں رات کے کھانے پر بلایا۔ آمنہ ابوالحسن کے ساتھ ان کی نوزائیدہ بچی نیلوفر بھی تھی۔ کھانے سے پہلے جب بنے بھائی نے پینا شروع کیا تو بولے "بھئی آمنہ! آج ہم تمہاری بچی کو BAPTISE کریں گے۔ اسے سردی لگ رہی ہوگی۔ اس کے بعد انھوں نے وہسکی کا ایک قطرہ نیلوفر کے منہ میں ڈالا۔ اس نے وہسکی کے تلخ ذائقے کے جواب میں جب اپنے ہونٹ سکیڑ لیئے تو بنے بھائی کے ہونٹوں پر بچوں کی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ نہ جانے کتنی دیر تک اس بچی کو خوش کرنے اور ہنسانے کی کوشش میں لگے رہے۔ یوں لگا جیسے اس رات کی اصل مہمان وہی بچی تھی۔ میں نے رضیہ آپا سے کہا "رضیہ آپا، بنے بھائی تو نوزائیدہ بچوں تک کی ہمت افزائی کرنے سے نہیں چوکتے"! اس رات پتہ چلا کہ چھوٹے بچے بنے بھائی کی کتنی بڑی کمزوری تھے۔

بنے بھائی اپنی شخصی زندگی میں بڑے محتاط اور معتدل واقع ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے رضیہ آپا خوش قسمت ہیں کہ انھیں کبھی بنے بھائی کو اس طرح سدھانا نہیں پڑا جس طرح دیگر شاعروں اور ادیبوں کی بیویاں اپنے شوہروں کو سدھاتی ہیں۔ سدھا سدھایا شوہر کیسے ملتا ہے؟

تبے بھائی جب اپنی آخری روس یاترا پر جانے لگے تو دو دن پہلے مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر بولے "دلی میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے" وہ ہر چند دنوں کے بعد مجھ سے یہ سوال پوچھ لیا کرتے تھے۔ اُس دن میں نے اپنی ایک پریشانی کا ذکر کیا تو بولے "میں ماسکو سے آلوں تو ملنا۔ تمہارے مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔"

پھر وہ ماسکو چلے گئے۔ جب وہ ماسکو میں تھے تو ہم چند احباب نے غالب اکیڈمی میں "مزاح نگاروں کے ساتھ ایک شام" کے عنوان سے ایک محفل منعقد کی۔ اور رضیہ آپا سے خواہش کی کہ وہ اس محفل میں تبے بھائی پر ان کا لکھا ہوا خاکہ پڑھیں۔ رضیہ آپا نے یہ خاکہ پڑھا۔ اُن کے ایک ایک جملے پر محفل زعفران زار بن گئی۔ خاکے میں رضیہ آپا نے ایک جگہ لکھا تھا: "سجاد ظہیر جب گھر سے نکلتے ہیں تو ان کے گھر لوٹنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ کبھی سرِ شام آ جائیں گے اور کبھی رات دیر گئے"، "ایک بار یہ گھر سے ایسے گئے کہ پانچ چھ سال بعد لوٹے"۔ (پانچ چھ سال بعد لوٹنے کی بات رضیہ آپا نے اُن کی پاکستان یاترا کے پس منظر میں کہی تھی) اس بات پر سامعین نے فلک شگاف قہقہے بلند کئے۔ اس محفل کے بعد ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ اطلاع آئی کہ تبے بھائی اب کی بار کبھی نہ لوٹ آنے کے لئے گھر سے گئے تھے۔ پھر اُن کی نعش جب آخری دیدار کے لئے ونڈسر پلیس میں رکھی گئی تو میں نے سوچا کہ اب کی بار آنکھیں تبے بھائی کی دلکش اور دلفریب مسکراہٹ کو دیکھنے سے محروم رہ جائیں گی۔ مگر جب میں ان کی نعش کے قریب

پہنچا تو دیکھا کہ پھولوں کے ڈھیر میں اُن کے ہونٹ تب بھی مسکرا رہے تھے۔ موت نے بنّے بھائی کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ لیکن ان کی مسکراہٹ موت کی زد سے پرے تھی۔ یہ بڑی عجیب و غریب مسکراہٹ تھی۔ بڑی اٹل، اٹوٹ، مستحکم، عزم والی، اور راسخ العقیدہ مسکراہٹ۔ جیسے یہ مسکراہٹ بنّے بھائی کی ساری زندگی کا نچوڑ تھی۔ اُن کا عقیدہ اور ان کا نظریہ تھی۔ میں اس حیران کن مسکراہٹ کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس مسکراہٹ کو حرف حرف پڑھنا چاہتا ہوں۔ یہ کیسی مسکراہٹ ہے آخر؟ ——— میں سوچنے لگا قدیم وحشی انسان کے غیر مہذب اور بے ہنگم قہقہے سے لے کر بنّے بھائی کی مسکراہٹ تک انسانی تہذیب نے جو نشیب و فراز دیکھے ہیں اور جو آگہی حاصل کی ہے وہی آگہی اصل میں بنّے بھائی کی مسکراہٹ ہے۔ پھر مجھے بنّے بھائی کی مسکراہٹ سمندر کی ایک لہر کی طرح دکھائی دی جو ہر دم آگے ہی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ مسکراہٹ جو کینوس یا ہونٹوں میں قید ہونا نہیں جانتی بلکہ ہر دم زندگی کی خوشگواری، جد و جہد اور عمل کا حصہ بنا جانتی ہے۔

(۱۹۷۸ء)

○

ابراہیم جلیس

ابراہیم جلیس افسانہ نگار تھے مگر میرے لئے صرف افسانہ تھے۔ حالاں کہ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔

وہ پڑوسی ملک کے شہر کراچی میں رہتے تھے۔ مگر لگتا تھا کہ وہ لاکھوں کروڑوں میل دور ہیں۔ حالاں کہ یہ فاصلہ چند سو میل سے زیادہ کا نہیں تھا۔

وہ مجھ سے بارہ تیرہ برس بڑے تھے۔ لیکن لگتا تھا وہ کافی عمر رسیدہ ہو گئے ہیں حالانکہ ان کی عمر ۴۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔

حقیقت جب افسانہ بن جاتی ہے، فاصلے جب پھیل جاتے ہیں، عمریں جب دھوکہ دینے لگتی ہیں تو دو بھائیوں کے رشتے کتنے بے بس، مجبور اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔

بھائی ہونے کے ناتے آج جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ بچپن کی کچھ دھندلی سی یادوں، ۱۹۶۰ء میں ایک مہینہ کا ساتھ، سال میں ایک یا دو بار آنے والے ان کے خط اور ان کے بارے میں ان کے دوستوں سے سنی ہوئی باتوں کے سوائے میرے دامن میں کچھ بھی نہیں ہے۔ دو ملکوں میں بسے ہوئے بھائیوں کی کل کائنات یہی ہے۔ سرحد صرف دو ملکوں کے درمیان سے نہیں گزرتی بلکہ رگوں میں دوڑنے والے ایک ہی خون کو بھی کاٹ دیتی ہے۔

بچپن کی دھندلی یادوں کی مدد سے جب میں اپنے ذہن میں ان کی شبیہ بنانا چاہتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بچپن میرا نہیں کسی اور کا تھا اور جو شبیہ میرے ذہن میں بن رہی ہے وہ جلیس صاحب کی نہیں کسی اور کی ہے۔ زندگی کا وہ مرحلہ بڑا کرب ناک ہوتا ہے جب آدمی کا اپنا بچپن خود اسے اجنبی دکھائی دے۔

میرے ہوش سنبھالنے تک جلیس صاحب گلبرگہ ہائی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد علی گڑھ چلے گئے تھے۔ البتہ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ گلبرگہ آیا کرتے تھے۔ مگر خاندان والوں کے لئے ان کا آنا نہ آنا برابر ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ دوستوں کے رسیا تھے۔ ہر دم دوستوں کے جھمیلوں میں گھرے رہتے تھے۔ اور گرمی کی چھٹیاں اپنے دوستوں کے ساتھ گزار کر علی گڑھ واپس چلے جاتے تھے والد صاحب کی خواہش تھی کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر سیول سروس کا امتحان دیں اور کسی بڑے عہدے پر پہنچ جائیں لیکن انٹرمیڈیٹ کے طالب علم ہی تھے کہ انھوں

نے پہلا افسانہ لکھ کر سیول سروس کی ساری ذمہ داریوں سے سبک دوشی اختیار کر لی اور والد صاحب نے چپ چاپ اپنی خواہش کو واپس لے لیا۔ والدین بہت سے کام یوں ہی خاموشی کے ساتھ کیئے جاتے ہیں۔ اور اولاد کو اپنی خواہش کا علم نہیں ہونے دیتے۔

بچپن کی یادوں میں ایک یاد میرے ذہن میں بہت نمایاں ہے کبھی کبھار جلیس صاحب کو دوستوں سے فرصت ملتی تو خاندان کے چھوٹے بچوں کو بھوتوں کی کہانیاں سنا کر ڈراتے تھے۔ یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انہیں بھوتوں کی ایسی خوف ناک کہانیاں یاد تھیں کہ انھیں سن کر ریڑھ کی ہڈی تک لرز جاتی تھی۔ اکثر کہانیاں خود ان کے ذہن کی پیداوار ہوتی تھیں کیونکہ بڑے ہو کر نہ میں نے یہ کہانیاں کہیں پڑھیں نہ سنیں۔ یہ ان کی افسانہ نگاری کا فطری آغاز تھا۔ ان کہانیوں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ ان میں ایک ظالم بھوت ہوتا تھا اور ایک مظلوم آدمی۔ اگرچہ کہانی کے آخر میں وہ مظلوم آدمی کے ہاتھوں ہی اس ظالم بھوت کا خاتمہ کراتے تھے۔ لیکن ظالم بھوت کے ظلم کی تفصیلات اور مظلوم آدمی کی جدوجہد اور حوصلے کو وہ ایسی اثر انگیزی کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ ہم دم بخود رہ جاتے تھے۔ جب کوئی خوفناک کہانی سنا لیتے تو بچوں کے چہروں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کرتے تھے کہ کون کتنا ڈر رہا ہے۔ کوئی بچہ زیادہ ڈر جاتا تھا تو ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہتے تھے" ارے یہ تو صرف کہانی ہے۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ـــ؟ بھوت آئے گا تو میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ میں اکیلا ہی دنیا کے سارے بھوتوں

کا مقابلہ کر سکتا ہوں''۔ ان کے ان جملوں سے ہمیں بڑی ہمت ملتی تھی۔

جلیس صاحب زندگی بھر بھوتوں سے لڑتے رہے اور ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کرتے رہے۔ یہ بات ان کی فطرت میں بنیادی اہمیت رکھتی تھی ــــــ

ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ ہر کام میں جلد بازی دکھاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی رگوں میں خون نہیں پارہ دوڑ رہا ہے۔ جذباتی انسانوں کا خون اکثر یوں ہی پارے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ زندگی کے ہر کام میں انھوں نے عجلت کی۔ ابھی علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہی تھے کہ وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں مشہور ہو چکے تھے۔ میرے سب سے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے ابھی گریجویشن بھی نہیں کیا تھا کہ یہ علی گڑھ سے گریجویٹ ہو کر گلبرگہ واپس آئے۔ حالانکہ بھائیوں میں ان کا نمبر تیسرا تھا۔ ۲۰ سال کی عمر میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''زرد چہرے'' شائع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ افسانوں کے اپنے پہلے مجموعہ کی کچھ کاپیاں لے کر گلبرگہ آئے تھے۔ جب انھوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ والد صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو جلیس صاحب کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے انھیں سول سروس کا امتحان نہ دینے کا دکھ ہو۔

جلیس صاحب باغی اور سرکش ادیب تھے لیکن جب وہ والد صاحب اور میرے سب سے بڑے بھائی محبوب حسین جگر صاحب کے روبرو ہوتے تو ان کی ساری بغاوت، ساری سرکشی اور ساری شگفتہ مزاجی کافور ہو جاتی تھی۔

ان دونوں شخصیتوں کے سامنے ان کی آنکھیں ہمیشہ جھکی ہوئی ہوتی تھیں۔ بات بھی دو چار جملوں سے زیادہ نہیں کرتے تھے اور آئے جاؤں واپس آکر پھر بغاوت اور سرکشی سے ہم کنار ہو جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے کردار کی تربیت انہی دو شخصیتوں کی مرہون منت تھی۔

میرے والد نے جب انہیں ایک افسانہ نگار کے روپ میں تسلیم کر لیا تو انھوں نے دور اندیشی کے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ان کی شادی کسی مالدار گھرانہ میں کی جائے چنانچہ جس سال ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا، اسی سال ان کی شادی گلبرگہ کے ایک نہایت متمول اور مال دار گھرانے میں ہوئی۔ گلبرگہ کی "حیدر بلڈنگ" میں ان کی شادی کی دھندلی دھندلی سی یادیں اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ فطرتاً دولت، عیش و آرام، اُمورِ خانہ داری اور اس قماش کی دیگر دنیاوی مصروفیات سے بالکل بے نیاز تھے لہٰذا چند ہی دنوں بعد وہ اپنی ادبی مصروفیات میں الجھ گئے۔

جلیس صاحب کی زندگی کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ بحرانوں اور طوفانوں کے پروردہ تھے۔ زندگی میں جب کوئی بحران نہیں ہوتا تھا وہ ایک بحران پیدا کر لیتے تھے۔ وہ بحران کے بغیر شاید زندہ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی میں دو چیزیں تھیں۔ طوفان یا طوفان سے پہلے کی خاموشی۔ اس دنیا میں بہت کم لوگ اپنے جذبہ کی سطح تک پہنچ کر زندہ رہتے ہیں۔ مگر جلیس صاحب اس سطح تک پہنچ کر زندہ رہے۔ جذبہ نے ان سے جو کہا انھوں نے وہ کر دکھایا۔

یہی وجہ ہے کہ زندگی کی یکسانیت کو وہ کبھی برداشت نہ کرسکے ہمیشہ اپنے جذبہ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی وہ کسی ملازمت سے دو سال سے زیادہ وابستہ رہے ہوں۔ کچھ مہینوں کے لئے وہ حیدرآباد کے ایک سرکاری محکمہ کے پبلسٹی آفیسر بھی رہے مگر اس محکمے کے وزیر سے لڑکر انہوں نے اس ملازمت کو چھوڑ دیا۔ وزیروں اور سرمایہ داروں سے لڑنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انہوں نے فطرت ہی کچھ ایسی پائی تھی کہ ہمیشہ اپنے سے طاقتور آدمی سے ٹکر لیتے تھے۔ اور وہ اکثر اس لڑائی میں فاتح بن کر نمودار ہوتے تھے۔ ان کے یاس ان فتوحات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یہی ان کی زندگی کی کمائی تھی۔ چند دن فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کرنے گئے اور ساحر لدھیانوی کے ساتھ بمبئی کی سڑکوں کی خاک چھانی۔ ان میں صبر کا مادہ بالکل نہیں تھا۔ لہٰذا چند ہی دنوں میں بمبئی کے فلم سازوں سے لڑ لڑا کر واپس چلے آئے۔ عملی زندگی میں ان کا حال اس بچہ کا سا تھا جو ریت کے گھروندے بنا بنا کر توڑتا جاتا ہے۔ اور کبھی کسی گھروندے سے مطمئن نہیں ہوتا۔ انہوں نے جو کچھ کمایا اپنے قلم سے کمایا۔ غیرت اور خودداری کا یہ حال تھا کہ کبھی اپنی بیوی کی جائیداد، ان کی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

ان کے لکھنے کی رفتار حیرت انگیز تھی۔ اپنا مشہور ناول چالیس کروڑ بھکاری، انہوں نے آٹھ دس دن کے اندر لکھا تھا۔ پچیس برس کی عمر میں انہوں نے ایک ادیب کی حیثیت سے وہ شہرت حاصل کرلی تھی جو بہت سوں کو پچاس برس قلم گھسنے کے باوجود حاصل نہیں ہوتی۔ وہ جب ادیبوں سے بھی الجھتے تھے تو اس احتیاط کو

بطور خاص ملحوظ رکھتے تھے کہ جس ادیب پہ وار کیا جائے وہ چوٹی کا ادیب ہو ورنہ ٹکر لینے کا فائدہ ہی کیا ہوا۔

۱۹۴۸ء میں وہ زندگی کے ایک بہت بڑے بحران سے گذرے اور ایک دن خاندان والوں کو پتہ چلا کہ وہ ہندوستان سے چلے گئے ہیں۔ والد صاحب کو پورے دو مہینوں بعد ان کے ہندوستان سے چلے جانے کی اطلاع ملی۔ کئی دنوں تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ پھر پتہ چلا کہ وہ لاہور میں کسی اخبار سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ پھر چند ہی دنوں بعد ان کا مشہور رپورتاژ "دو ملک ایک کہانی" چھپ کر آیا۔

جلیس صاحب کی یہ وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے نہ صرف اس برصغیر کو تقسیم کرنے والی سیاست سے ٹکر لی تھی۔ بلکہ اپنے آپ سے بھی ٹکر لی تھی۔ یہیں انھوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کو بڑے جتن کے ساتھ پھر سے جوڑا تھا۔ اور بڑی بے باکی اور بے جگری کے ساتھ اپنے آپ کو بھی نشانہ ملامت بنایا تھا۔ یہ کتاب اوروں کے لئے تو اس برصغیر کی تاریخ کے ایک سنگین دور کی دستاویز ہے لیکن خود جلیس صاحب کے لئے یہ کتاب "تزکیۂ نفس" کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی کتاب کے ذریعہ انھوں نے اپنے دل میں چبھے ہوئے کانٹوں کو چن چن کر باہر نکالا اس کتاب کے بعد وہ پھر ایک بار چٹان کی طرح مضبوط بن گئے اور نئے تجربوں سے ٹکر لینے کے لئے بِل ٹھوکے ہوئے۔

جلیس صاحب کی زندگی کے وہ دن بڑے کٹھن تھے۔ نیا ملک، نئی سرزمین

نئے لوگ، ان حالات میں اپنے لئے جگہ بنانا ان کے لئے کتنا دشوار تھا. مگر وہ ہمت ہارنا جانتے ہی نہ تھے. ان کے بچے اور بیوی برسوں یہیں ہندوستان میں رہے۔ وہ بیوی بچوں اور اپنے وطن، اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب کے لئے تڑپتے رہے لیکن کبھی مایوس نہیں ہوئے. نفرت، لوٹ کھسوٹ، اور انسان دشمن نظریات کے خلاف انھوں نے بدستور اپنی جنگ جاری رکھی. اس ضمن میں وہ جیل بھی گئے. والد صاحب کو جب پاکستان میں ان کی گرفتاری کا پتہ چلا تو وہ اس اطلاع سے یوں خوش ہوئے جیسے ان کی کوئی دیرینہ خواہش پوری ہوئی ہو، پرانی نسل کے لوگ بھی کیسی کیسی باتوں پر خوش ہونا جانتے تھے. اور آج ہماری خوشیاں کتنی مختلف ہیں.

جیل میں ہی انھوں نے اپنی مشہور کتاب "جیل کے دن جیل کی راتیں" لکھی لیکن سچائی کو زیادہ دنوں تک سلاخوں کے پیچھے بند نہیں رکھا جا سکتا تھا. وہ جیل سے باہر آئے تو فاتح بن چکے تھے.

وہ روزنامہ "جنگ" میں طنزیہ کالم لکھا کرتے تھے. اس کے بعد انھوں نے افسانہ نگاری سے کم وبیش کنارہ کشی اختیار کر لی. اور ایک صحافی کی حیثیت سے شہرت کی نئی منزلیں طے کرنے لگے. سابق صدر امریکہ لنڈن بی جانسن کی شخصی دعوت پر امریکہ گئے. چین کی سیاحت کی، ماؤزے تنگ سے ملے، روس گئے، مشرق وسطیٰ گئے. یورپ گئے، مشرق بعید گئے. غرض دنیا کے ہر ملک کی سیاحت کی. چار سال پہلے وہ ہانگ کانگ جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لئے

دہلی کے ہوائی اڈہ پر بھی رہ کے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنے ایک بھائی سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ہیں۔ لیکن عملاً یہ فاصلہ کتنا لمبا تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ ایک خط لکھ کر دہلی کے ہوائی اڈہ پر پوسٹ کر دیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہ زندگی کے سفر میں رکنا اور پلٹ کر دیکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ سفر، مدام سفر ہی ان کا نصب العین تھا پاکستان جا کر بھی انھوں نے عملی زندگی کے بارے میں اپنا انداز نہیں بدلا۔ ہر دوسرے تیسرے سال وہ کوئی نئی ملازمت ڈھونڈ لیتے تھے۔ اخباروں میں طنزیہ کالم لکھے فلمیں بنائیں، روزنامہ انجام کے ایڈیٹر بنے اور اپنا ذاتی اخبار "عوامی عدالت" نکالا۔ آخر وقت میں وہ روزنامہ "مساوات" کے ایڈیٹر بن گئے تھے۔

۱۹۶۰ء میں وہ ایک مہینہ کے لئے حیدرآباد آئے تھے، حیدرآباد سے انھیں بے پناہ پیار تھا۔ اسی شہر میں انھوں نے شہرت کی ابتدائی منزلیں طے کی تھیں۔ یہیں سے اپنے باضابطہ ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اسی شہر کے گلی کوچوں میں ان کی جوانی بیتی تھی۔ یہیں انھوں نے مستقبل کے سہانے خواب دیکھے تھے۔ حیدرآباد کے احباب اور حیدرآباد کے لوگ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھے۔ ان کی آمد کے موقع پر جب حیدرآباد میں جلسہ ہوا تو ادب دوستوں کا ایک سیلاب تھا جو امڈ آیا تھا۔ وہ اس والہانہ محبت کو اپنے دل میں سمیٹے چپ چاپ پاکستان لوٹ گئے۔ جاتے ہوئے کہہ گئے تھے۔ "دو تین سال بعد میں پھر آؤں گا" سترہ برس بیت گئے مگر وہ پھر کبھی نہ آئے۔ زندگی کی جدوجہد نے انھیں پھر مہلت ہی نہ دی۔ جاتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ رونا بالکل نہیں

جانتے تھے۔ حالاں کہ وہ اپنے شہرنگاراں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہے تھے۔

میں نے جب ۱۹۶۲ء میں مزاح نگاری شروع کی تو وہ اس اطلاع پر بے حد خوش ہوئے تھے۔ بڑے پیار کے ساتھ انھوں نے میرے پہلے مضمون کی تعریف میں خط لکھا تھا۔ وہ خط لکھنے کے معاملے میں خاصے لاپروا تھے۔ سال میں دو ایک بار خط لکھ کر اپنی خیریت کی اطلاع ہم لوگوں کو پہونچایا کرتے تھے۔ ان کا آخری خط میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کے نام آیا تھا۔ یہ خط ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو لکھا گیا تھا۔ اس خط میں بہت سی خانگی باتیں کرنے کے بعد میرے بارے میں ایک جملہ یہ لکھا تھا۔

"مرنے سے پہلے کرشن چندر کا ایک خط ۲۸ فروری کا لکھا ہوا ملا جس میں لکھا تھا۔ اِدھر ہند میں مجتبیٰ نے دھوم مچا رکھی ہے۔ چشم بد دور" ——— یہ جملہ پڑھ کر دل کئی دن مسرت سے معمور رہا۔"

جگر صاحب نے یہ خط مجھے بھیج دیا تھا۔ ان کی مسرت کے خیال سے میں بھی کئی دن مسرور رہا کیوں کہ میں انھیں کسی اور طرح مسرت نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ہم لوگوں کے درمیان اب ایسی ہی چھوٹی موٹی مسرتیں رہ گئی تھیں۔

جلیس صاحب نے اپنی زندگی کے بہت سے کام جلد ہی کر ڈالے تھے شاید انھیں پتہ تھا کہ کارجہاں بہت زیادہ دراز نہ ہوسکے گا۔ مگر انھیں اپنے خاندان کے لئے بہت کچھ کرنا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی خوش حالی کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دو لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے تھے۔ انھیں اپنے گھر سے وداع کرنا تھا۔ وہ سماج اور انسانیت سے وابستہ اپنے کاموں کو پورا کرنے کے

بعد اپنے گھر کی طرف توجہ دینا چاہتے تھے۔ لیکن بیچ راستے میں ہی زندگی کی شام آگئی۔

وہ زندگی بھر بحرانوں اور طوفانوں سے گزرے۔ ہم لوگ ان کے بحرانوں سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ یقین بھی رہتا تھا کہ وہ ان بحرانوں پر قابو پالیں گے، کیونکہ ۴۵ برس سے یہی ہوتا آرہا تھا۔

ان کے انتقال سے تین چار دن پہلے ہندوستان کے اخبارات میں ان کی پریس کانفرنس کی رپورٹ چھپی تھی جس سے پتہ چلا کہ پاکستان کی فوجی حکومت نے ان کے اخبار پر قبضہ کرلیا ہے۔ اور یہ کہ ان کا اخبار اب شایع نہیں ہوگا۔ اس خبر کو پڑھ کر تشویش ضرور ہوئی تھی مگر یقین تھا کہ وہ حسب معمول اس بحران سے فتح یاب ہو کر نکلیں گے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو جب کہ جلیس صاحب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے پورے ۲۷ گھنٹے بیت چکے تھے۔ اور ان کا جسد خاکی منوں مٹی کے بوجھ تلے دب چکا تھا تب مجھے "ٹائمس آف انڈیا" کی خبر سے پتہ چلا کہ ارض دکن کے باغی ادیب نے سندھ کی وادی میں اپنا پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ دو بھائیوں کے بیچ کمیونیکیشن کا یہی ایک سنگین ذریعہ رہ گیا تھا۔ ان کے انتقال سے دو ملکوں میں رہنے والے بھائیوں کے درمیان دبی دبی سی جو ایک کہانی ۲۹ برسوں سے جاری تھی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ کہانیاں یوں ہی زمانہ اور تاریخ میں بکھر جاتی ہیں مجھے جلیس صاحب کی وہ بھوتوں والی کہانیاں بہت یاد آئیں جن میں وہ ہمیشہ مظلوم کے ہاتھوں ظالم کا خاتمہ کرواتے تھے۔ جب تک کہانیاں ان

کے قبضۂ قدرت میں رہیں۔ کبھی بھوتوں کو یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ مظلوم کا خاتمہ کرسکیں۔ مگر جلیس صاحب کی مجبوری یہ تھی کہ وہ خود اپنی زندگی کی کہانی کے خالق نہیں بن سکتے تھے؛ جبھی تو ان کی زندگی کی کہانی کا انجام ویسا نہیں ہوا جیسا کہ ان کی لکھی ہوئی کہانیوں کا ہوتا تھا۔ اس دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک کہانی کار اپنی مرضی سے اپنی زندگی کی کہانی کے انجام کا فیصلہ کرے۔

(نومبر ۱۹۷۷ء)

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں فکر تونسوی کی نئی تصنیف "بدنام کتاب"
کی رسم اجراء کے موقع پر ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی نیا مضمون پڑھوں
پرانی شخصیت کے بارے میں کوئی نیا مضمون پڑھنا یوں بھی دشوار کام ہے ابھی
دو سال پہلے میں نے ان کی شخصیت پر ایک بھرپور خاکہ لکھا تھا۔ اب پھر ان کی
شخصیت کے بارے میں نیا مضمون لکھنے کی فرمائش پر مجھے وہ لطیفہ یاد آ رہا ہے
کہ ایک نواب صاحب کو کسی نے بتا دیا کہ علی الصبح گھوڑے کی سواری کی جائے
تو صحت اچھی رہتی ہے۔" نواب صاحب فوراً بازار گئے ایک سائیس خرید کر لے
آئے اور ایک گھوڑے کو ملازم رکھ لیا۔ سائیس کو پابند کیا کہ وہ انہیں گھوڑا سواری
کے لئے علی الصبح جگا یا کرے دوسرے دن سائیس علی الصبح گھوڑے کو تیار کر کے

نواب صاحب کی خواب گاہ میں انہیں جگانے کے لئے پہنچا بڑی آوازیں دیں تو نواب صاحب نے سوتے سوتے ہی پوچھا "بولو کیا ہے ؟" سائیس بولا "حضور گھوڑا سواری کے لئے تیار ہے"۔ نواب صاحب نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو پھر سے بند کرتے ہوئے کہا "تم ذرا گھوڑے پر زین ڈال دو، میں ابھی بیدار ہوتا ہوں"۔ آدھے گھنٹے بعد وہ پھر نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچا اور دوبارہ انہیں جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب کی بار نواب صاحب نے لال لال ڈوروں والی آنکھیں کچھ دیر کے لئے کھولیں اور پوچھا "بولو کیا ہے؟"

سائیس نے دست بستہ عرض کی "حضور گھوڑا سواری کے لئے تیار ہے بیدار ہو جائیے"۔

نواب صاحب نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "میں نے تو تم سے کہا تھا کہ گھوڑے پر زین ڈال دو" سائیس نے کہا "سرکار آپ کے حکم کی تعمیل میں میں نے گھوڑے پر زین ڈالدی ہے"۔

اس پر نواب صاحب نے ایک لمبی جماہی لے کر کروٹ بدلتے ہوئے کہا "جاؤ تھوڑی سی زین اور ڈال دو"۔

اب میرے اس نئے مضمون کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ میں نکر تونسوی پر تھوڑی سی زین اور ڈالنے بیٹھا ہوں۔ مجبوری سائنس اور ادب سے کیا نہیں کروانی۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ میں نے ان پر پہلا مضمون دو سال پہلے لکھا تھا۔ ان دو برسوں میں بہت کچھ ہو گیا ہے۔ ان دو برسوں میں وہ مزید بوڑھے

ہو گئے ہیں اور میں مزید جوان ہو گیا ہوں، قانون قدرت کو یہی منظور تھا۔ پھر ان دو برسوں میں وہ مجھ سے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت دور ہو جائیں گے۔ میں نے پہلے مضمون میں بہت سی ایسی باتیں لکھ دی تھیں جنہیں بعد میں فکر تونسوی نے اپنے عمل سے غلط ثابت کر دیا۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ فکر تونسوی کا ایک اغلاط نامہ شائع کیا جائے، چاہے اس کے لئے مجھے تھوڑی سی زمین اور دتا لینے کی زحمت کیوں نہ اٹھانی پڑ جائے۔

یہ حضرت "جو بیباک ماترے دیم" سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں، بڑے عجیب و غریب آدمی ہیں۔ اونٹ کی کل سیدھی بھی ہو سکتی ہے لیکن ان کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس دنیا میں کیا کرنے کے لئے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ آپ کہیں گے، اردو میں طنز نگاری کرنے آئے ہیں۔ مانا کہ طنز نگاری کرنے آئے ہیں۔ مگر میری غرض یہ ہے کہ طنز نگار بڑا ہوشیار آدمی ہوتا ہے وہ دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے اپنے مکان کی دیواروں کو نہ صرف بلند کر لیتا ہے بلکہ انھیں مضبوط بھی بنا لیتا ہے۔ وہ بڑی ہوشیاری اور کسی حد تک عیاری سے اپنی ذات کو کچھ اس طرح ڈھالتا ہے کہ کسی کو اس پر طنز کرنے کا موقع نہ ملے اگر اس کو معیار مانا جائے تو گستاخی معاف یہ جو حضرت فکر تونسوی اردو کے بڑے طنز نگار بنے پھرتے ہیں۔ دنیا کے بے وقوف ترین آدمی ہیں۔ ان کی ذات بابرکات کا جتنا مذاق اڑایا جا سکتا ہے، اتنا شاید ہی کسی کا اڑایا جا سکے۔ یہ اتنے بڑے طنز نگار ہیں۔ مگر چھوٹی سے چھوٹی بات پر اتنے خوش ہوں گے کہ دیکھنے والا افسوس کرنے لگ جائے۔ ایک بار میرے سامنے

اِسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہے تھے ابھی انتظار کے دو سکنڈ بھی نہ گزرے تھے کہ بس آ گئی اور اتفاق سے خالی آ گئی اب اس بات پر جو نکتو نسوی خوش ہوئے تو بس خوش ہوتے ہی چلے گئے۔ بار بار کہتے "بھئی کمال ہے آج ہمیں اتنی آسانی سے بس مل گئی"۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہوئے وہ بس میں داخل تو ہوئے ہی تھے مگر جب بس سے اترنے لگے تو تب بھی تالیاں بج رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر چلنے لگے تو پھر کہا "یار ایمان سے مجھے تو حیرت ہو رہی ہے یقین ہی نہیں آتا کہ ہمیں اتنی آسانی سے بس مل گئی"۔ کافی ہاؤس پہنچے تو دوستوں کی میز پر پہنچتے ہی خوشی سے اچھل کر کہا "یارو! تم یقین نہیں کرو گے آج ہمیں دو سکنڈ میں ہی بس مل گئی۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ آؤ آج اس خوشی میں ہم سب کو کافی پلاتے ہیں"۔ دو سکنڈ میں بس کو پکڑ کر وہ یوں سمجھ رہے تھے جیسے وہ زندگی میں بہت آگے نکل گئے ہوں۔ میں چپ چاپ انہیں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

چند دنوں بعد ان کی کتاب "بجو بیٹ راجہ" کو اتر پردیش اُردو اکیڈیمی کا انعام ملنے کی اطلاع آئی۔ میں نے سوچا جو آدمی بس پکڑ کر اتنا خوش ہو سکتا ہے وہ یقیناً ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام پا کر پھولے نہیں سمائے گا۔ میں ان سے شام میں کافی ہاؤس میں ملا تو بڑے اداس بیٹھے تھے۔ لگتا تھا گھر میں بیوی سے لڑ کر آئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید انہیں انعام کی خوشخبری اب تک نہ ملی ہو۔

میں نے کہا "کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ کی کتاب کو یوپی اکیڈیمی کا انعام ملا ہے"؟ یہ سنتے ہی آنکھوں میں تقریباً تین چار آنسو لا کر بولے "یار! یہ بہت بُرا ہوا

ایمان سے میں انعام تسنام میں یقین نہیں رکھتا. تم نے ہی زبردستی میری کتابیں بھجوادی تھیں. مجھے تو بڑا دکھ ہو رہا ہے ایمان ہے ــــــ وہ کون ہوتے ہیں مجھے انعام دینے والے کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہ سب کچھ انعام اور صلے کے لئے لکھتا ہوں تم نے میرے خلاف ایک بڑی سازش کی ہے میں اپنے آپ کو کرپٹ نہیں کرنا چاہتا ۔"

میں نے کہا "آخر بات کیا ہوئی آپ اتنے خفا کیوں ہیں ؟ "

بولے" ایمان سے مجھے بڑی شرم آرہی ہے کیا تم نے انعامات کی فہرست میں ڈیڑھ ہزاری منصب داروں کے نام پڑھے ہیں؟ میں نے کہا "ہاں ! میں نے سارے نام پڑھے ہیں "

بولے" بیٹا ! کچھ تو شرم کرو میں اچھا خاصا کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا. تم نے مجھے زبردستی گھسیٹ کر کن لوگوں کے ساتھ کھڑا کر دیا ہے " اس کے بعد میں مسلسل ہنستا رہا اور وہ مجھے مسلسل کوستے اور گالیاں دیتے رہے. پھر وہ کئی دن تک کافی ہاؤس نہیں آئے. میں نے ایک دن فون کر کے وجہ پوچھی تو کہنے لگے " یار! ایمان سے ! اب میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گیا ہوں ہر کوئی مبارکباد دے دے کر مجھے چھیڑ رہا ہے میں مزید چند روز تک کافی ہاؤس آنے کا ارادہ نہیں رکھتا. مجھے رہ رہ کر تم پر غصہ آرہا ہے "

ایک طرف تو ان حضرت کے غصہ کا یہ عالم تھا. چند دنوں بعد نارمل ہو گئے. تو ایسے نارمل ہوئے کہ دو دن بھی میں ان سے نہ ملوں یا فون نہ کروں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔

ایک بار میں کسی مصروفیت کی وجہ سے آٹھ دنوں تک ان کے پاس نہ جا سکا۔ اور پھر اتفاق سے اُن ہی دنوں میرا دفتر بھی منتقل ہو گیا وہ مجھے فون بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بے خبری کے آٹھ دن بڑے چین سے گزرے۔ نویں دن ایک دوست میرے پاس آئے اور کہنے لگے "یار فکرؔ صاحب تمہارے لئے بہت بے چین ہیں تم آج ان سے کسی طرح مل لو"۔ یہ دوست گئے تو ایک اور صاحب آئے اور کہنے لگے "بھئی! فکرؔ صاحب کو تم سے ایک ضروری کام ہے۔ وہ سخت پریشان ہیں تم ان سے آج ضرور ملو"۔

اس کے بعد تین چار احباب ملے اور انہوں نے ہو بہو یہی پیغام دیا۔ میں فطری طور پر پریشان ہو گیا کہ نہ جانے فکرؔ صاحب کس آفت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ شام کو ٹیکسی لے کر کافی ہاؤس پہنچا تو دیکھا کہ موصوف کافی ہاؤس کی ایک ٹیبل پر صحیح و سلامت بیٹھے ہیں۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو بڑی گرم جوشی سے ملے۔ بڑی شکایت کی کہ اتنے دن کہاں غائب رہے۔ ادھر میں نے مثالیں دے کر اپنے غائب رہنے کی ساری وجہیں بیان کیں۔ سن کر میری باتوں پر ایمان لے آئے۔ اور خاموش ہو گئے۔ پھر میں نے پوچھا "یہ تو بتایئے آخر وہ کیا کام تھا جس کی خاطر آپ نے اتنے سارے دوستوں کے ذریعہ مجھ تک پیغام پہنچایا"۔

بولے "کام؟ کیسا کام؟ کیا کام کے بغیر ہمیں نہیں ملنا چاہیے۔ کیا کام کے بغیر میں تمہارے لئے بے چین نہیں رہ سکتا؟ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ تم آج شام کافی ہاؤس آؤ کافی پیو کچھ باتیں ہوں۔ کچھ گپ شپ ہو کیا یہ کچھ اہم کام نہیں ہے؟"

میں نے کہا "مگر ٹیکسی کا کرایہ"!

ہنس کر بولے "وہ تو ٹیکسی ڈرائیور کے پاس ہی رہے گا"

اس دن میں نے محسوس کیا کہ یہ حضرت پٹری سے اُترے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ نارمل آدمیوں کی طرح پیش نہیں آنا چاہیے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے ہیں "مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے" ہوا کرے۔ مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے عشق فرمانے کے لئے مئی جون کی چلچلاتی دھوپ میں پیدل چل کر میرے دفتر پہنچیں اور صرف پانی کا ایک گلاس پی کر واپس ہو جائیں۔

میں نے فکر تونسوی کو جس قدر قریب سے دیکھا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ اردو کے اس بڑے طنز نگار کے اندر ایک معصوم گنوار بیٹھا ہوا ہے۔ یہ گنوار انھیں اپنے گھر کے خوبصورت صوفہ پر اکڑوں بٹھواتا ہے۔ یہی گنوار ان کے کان میں سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا رکھوا دیتا ہے۔ یہی گنوار انھیں چائے کی پیالیوں میں سگریٹ کی راکھ جھاڑنے پہ مجبور کرتا ہے۔ اور تو اور یہی گنوار ان سے ریفریجریٹر میں "بدنام کتاب" کے نسخے رکھواتا ہے۔ پرسوں میں نے ان کے گھر کا فریج کھولا تو دیکھا کہ "بدنام کتاب" کے دو نسخے بڑی قابلِ رحم حالت میں وہاں پڑے تھے۔ میں ریفریجریٹر میں کتابیں دیکھ کر ہنسنے لگا تو خفت مٹانے کے لئے بولے "بھئی! میں نے اصل میں پانی پینے کے لئے فریج کھولا تھا شاید غلطی سے یہ نسخے وہاں رہ گئے ایمان سے" پھر خود ہی کچھ سوچ کر ایک طنزیہ فقرہ میری طرف اچھالتے ہوئے بولے "مگر یار یہ کوئی غلط بات نہیں ہے اردو کی کتابیں اب ریفریجریٹر میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں"

میں پھر ہنسنے لگا تو بولے "دیکھو بیٹا! مجھے یہ فریج، یہ ٹی۔ وی۔ یہ صوفہ سیٹ

یہ قالین ایک آنکھ نہیں بھاتے ایمان سے میں نوبڑی مشکل کے ساتھ ان سے اڈجسٹ کرتا ہوں۔ یہ پھول کمار نہ جانے گھر میں کیا کیا لاکر بھرتا چلا جارہا ہے؟

فکر تونسوی نے یہ بات کچھ اس معصومیت سے کہی کہ میں اپنے سارے وجود میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس کرنے لگا۔ مجھے اپنے بچپن اور نوجوانی کے وہ دن یاد آگئے جو کھیتوں کے درمیان گزرے تھے۔ تازہ تازہ فصلوں کی مہک ہرے بھرے کھیتوں کی دوشیزگی، مویشیوں کی آوازیں سب کچھ ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے فکر تونسوی کے اندر چھپا ہوا گنوار میرے اندر چھپے ہوئے گنوار کو آنکھ مار رہا ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ ٹی۔ وی سیٹوں، ریفریجریٹروں، گیزروں، ایرکنڈیشنروں، صوفوں، سٹولوں اور نیون سائن لائیٹوں کے نیچے دبے ہوئے گنوار جب جاگ پڑتے ہیں تو کتنے معصوم اور قابل محبت نظر آتے ہیں۔

میں تو کہتا ہوں کہ یہ جو فکر تونسوی اپنے مضامین میں سچ بات کہتے ہیں تو یہ اصل میں وہ نہیں کہتے بلکہ ان کے اندر بیٹھا ہوا گنوار ان سے سچ کہلواتا ہے۔ اسی لئے تو ان کے سچ پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان حضرت کی کوئی ایک خامی ہو تو بیان کروں۔ ان کی ذات میں تو خامیوں کے دفتر کھلے ہیں۔ ایک بار مجھے اور قبلہ حضرت کو ایک جلسہ میں شرکت کے لئے حیدرآباد جانا پڑ گیا۔ ریل کا ریزرویشن نہیں مل رہا تھا۔ میں نے بڑی بھاگ دوڑ کی اور جان پہچان کے ایک کلرک کو فی برتھ دس روپے رشوت دے کر ریزرویشن کروا لیا۔ میں نے موصوف کو سارا ماجرا کہہ سنایا تو دوسرے دن "پیمانہ کے چھلکنے" میں اس کلرک کے خلاف

ایک لمبا چوڑا کالم لکھ مارا۔ کلرک دوسرے دن بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "غضب ہو گیا! آپ کے فکر صاحب نے میرے خلاف کالم لکھ دیا ہے۔ میں نے تو آپ کی مدد کی تھی۔ آپ نے اس کا خوب صلہ دیا!" کالم پڑھ کر مجھے بھی غصہ آیا اور اسی حالت میں حضرت کے پاس پہنچا۔ جب سارا ماجرا کہہ سنایا تو بڑے نادم ہوئے۔ کہنے لگے "بھول ہو گئی۔ آج کا کالم تو چھپ چکا ہے۔ پرسوں کا کالم اس کلرک کی حمایت میں لکھوں گا۔" میں نے کلرک کو اطلاع دی کہ اب اگلا کالم تمہاری حمایت میں آئے گا۔ تم فکر مت کرو۔" دوسرے ہی دن کلرک نے مجھے فون کر کے کہا "فکر صاحب سے کہیئے کے وہ اب میری حمایت میں کالم نہ لکھیں کیوں کہ ہمارے ڈپارٹمنٹ نے اب تک ان کے پہلے کالم کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ اب خواہ مخواہ اس مسئلہ کو چھیڑنے سے کیا حاصل؟" کلرک کی بات معقول تھی۔ میں پھر فکر تونسوی کے پاس گیا اور بولا "حضرت! اب آپ کالم نہ لکھیئے۔ کیوں کہ آپ کے پہلے کالم کا ڈپارٹمنٹ نے کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ معاملہ دب گیا ہے۔ اب آپ اس مسئلہ کو پھر کیوں چھیڑتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی حضرت آگ بگولہ ہو گئے۔ بولے "کیا کہا! ڈپارٹمنٹ نے میرے کالم کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ یہ تو سرا سر میری توہین ہے۔ میں اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ میں کل ہی اس ڈپارٹمنٹ کے خلاف کالم لکھوں گا کہ وہ عوامی شکایتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔" وہ تو ڈپارٹمنٹ کے خلاف کالم لکھنے پر تلے بیٹھے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے نتائج و عواقب سے انھیں آگاہ کر دیا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ ان نتائج و عواقب

سے اس بیچارے کلرک کی قسمت کس طرح وابستہ ہے۔ بڑی دیر کے بعد ان کی سمجھ میں بات آئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ورنہ بیچارے کلرک کا نہ جانے کیا بنتا۔

اسی حیدرآباد والے سفر کی بات ہے کہ ہم فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے اور فکر صاحب کا بیان تھا کہ وہ پہلی بار فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے ہیں۔ اسی لئے ڈبہ میں سوار ہوتے ہی انہوں نے ڈبے کی ایک ایک شئے کو چھو کر دیکھنا شروع کیا تاکہ پتہ چلے کہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ کیسا ہوتا ہے۔ ابھی وہ ڈبے کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ دو فوجی عہدیدار جنہیں ہمارے کیبن میں جگہ ملی تھی داخل ہو گئے حضرت نے دبی زبان میں مجھ سے کہا " یار! یہ تو بہت بُرا ہوا۔ کیا یہ حیدرآباد تک ہم پہ پہرہ دیتے رہیں گے؟"

میں نے کہا " لگتا تو ایسا ہی ہے"!

کچھ دیر تک حضرت چپ رہے۔ اور کہا:

" معاف کیجئے!" پھر کھلکھلاتے ہوئے فوجی عہدیداروں سے بولے:

" میں پہلی بار فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا ــــــــ"

وہ بولے " ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے"!

پھر حضرت خود ہی بولے " میں فکر تونسوی ہوں۔ اردو طنز و مزاح کا بریگیڈیر اور یہ ہیں مجتبیٰ حسین اردو طنز و مزاح کے فیلڈ مارشل"!

فوجی عہدیداروں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اب جو حضرت نے اس قہقہہ

کو بکڑ کر ان دونوں کے "چھلکے" اتارنے شروع کئے تو میں گھبرا گیا کہ کہیں یہ فکر تونسوی کے خلاف سنگینیں تان کر نہ کھڑے ہو جائیں۔ عجیب عجیب سوالات ان سے پوچھتے رہے۔ پوچھا" محاذ جنگ پر اگر آپ شکست کھا جائیں اور آپ کو مورچہ چھوڑ کر بھاگنا پڑے تو کیا آپ جوتوں سمیت بھاگتے ہیں یا آپ کو جوتے اتارنے پڑتے ہیں۔ اس معاملہ میں فوجی قانون کیا ہے؟"

اب بے چارے فوجی عہدیدار اس کا کیا جواب دیتے۔ نظریں جھکا کر خاموش ہو گئے فکر تونسوی نے پے بہ پے ان پر حملے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ آدھے سفر کے بعد دونوں تقریباً پسپا ہو گئے اور اپنی اپنی وردیوں میں سے باہر نکل آئے۔ حیدرآباد تک فکر تونسوی انھیں اس طرح تنگ کرتے رہے کہ لگتا تھا یہ دونوں فوجی عہدیدار نہیں" PRISONERS OF WAR " ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکندرآباد کے اسٹیشن پر یہ دونوں عہدیدار ہم سے نظریں بچا کر چھپتے چھپاتے اپنا سامان لے کر بھاگنے لگے تو حضرت نے پکار کر کہا" اب بھاگے جا رہے ہو تو ضرور بھاگنا مگر محاذ جنگ پر خدا کے لیے ہرگز نہ بھاگنا۔ یہ میری وصیت ہے سمجھے، ایمان سے!"

میں نے بعد میں حضرت کو آڑے ہاتھوں لیا کہ "یہ کیا آپ خطرناک مذاق کرتے ہیں۔ فوجی عہدیدار ہیں بندوق چلا دیں تو آپ ان کا کیا بگاڑ لیں گے؟"

بولے "یار! یہ تو دشمن پر ٹھیک ڈھنگ سے گولی نہیں چلا پاتے۔ مجھ پر کیا گولی چلائیں گے۔ یہ بات کہ میں نے انھیں کیوں چھیڑا تو بتیا جواباً عرض ہے کہ ٹکر ہمیشہ اپنے سے طاقتور آدمی سے لینی چاہیے۔ اور یہ بات بھی دھیان رکھ

رکھو کہ تلوار اور قلم کی جنگ میں ہمیشہ فتح قلم کی ہوتی ہے یہ کہہ کر حضرت سینہ یوں تان لیا جیسے وہ محاذ جنگ سے فتح یاب ہو کر واپس ہوئے ہوں۔

ان کی ایک اور کمزوری "لاہور" ہے جسے وہ پیار سے "لہور" کہتے ہیں۔ بات کسی بھی شہر کی چلے وہ اسے لاہور پر ہی لیجا کر ختم کریں گے۔ دلی میں انھیں رہتے ہوئے ۲۵ برس بیت گئے مگر ابھی تک اپنے آپ کو دلی کی سڑکوں اور گلیوں کے قابل نہیں بنا سکے۔ لاہور کا کہیں سے ذکر کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح لاہور ان کی آنکھوں میں سمٹ کر آجاتا ہے۔ ذرا اور ذکر کیجئے تو دیکھئے کہ کس طرح لاہور ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکنے لگتا ہے۔ کہیں گے جب سے لاہور چھوٹا ہے تب سے کسی شہر میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ لاہور کی کیا بات ہے۔ وہاں کا سورج ہی اور ہے چاند ہی الگ ہے۔ وہاں پانی ایسے نہیں بہتا جیسے یہاں بہتا ہے۔ وہاں چڑیاں ایسے نہیں چہچہاتیں جیسے یہاں چہچہاتی ہیں۔

ایک بار ایک پاکستانی نوجوان ادیب پاکستان سے ہندوستان آیا تو فکر تونسوی کو فون کیا۔ وہ بھاگے بھاگے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے "بھئی! لاہور سے ایک نوجوان ادیب آیا ہوا ہے۔ چلو ہم چل کے مل لیتے ہیں۔"

میں وہ اور مظفر حنفی مل کر پاکستانی ادیب کے پاس گئے تو فکر تونسوی وہاں جاتے ہی لاہوری ادیب سے یوں بغل گیر ہوئے جیسے انھیں پتہ ہی نہ ہو کہ ہم بھی ان کے ساتھ آئے ہیں۔

میں اور مظفر حنفی بیوقوفوں کی طرح بیٹھے رہے اور وہ دونوں "لہور لہور" کہتے

رہے۔ فکر تونسوی لاہوری ادیب سے مل کر سرحد پار چلے گئے اور میں اور مظفر حنفی ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے۔

لاہوری ادیب کو یہ پتہ نہیں تھا کہ فکر تونسوی ہندو ہیں۔ وہ نام کی مناسبت سے انھیں مسلمان ہی سمجھ رہا تھا۔ اس نے رازدارانہ انداز میں فکر تونسوی سے پوچھا "یہ بتلائیے آپ لوگ یہاں کس حال میں ہیں؟"

فکر تونسوی بولے "یہاں کیا اچھے رہیں گے جی۔ زندگی تو بس لاہور ہی میں ختم ہو گئی"

اس پر بھی نہ فکر تونسوی اس ادیب کی بات سمجھ سکے اور نہ ہی وہ ادیب فکر تونسوی کی بات کا مطلب سمجھ سکا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی اور رازدارانہ بات کہتا میں نے مذاق مذاق میں کہا "قبلہ! یہاں ہم لوگ کس حال میں ہیں؟ یہ سوال تو آپ ہم سے پوچھیئے۔ خدا کے فضل سے اچھے ہیں اور فکر تونسوی جیسے ہندو دوست ہمیں یہاں ملے ہوئے ہیں" وہ معاملہ کو تاڑ کر فوراً سنبھل گیا مگر فکر تونسوی تب بھی بات کا مطلب نہیں سمجھے اور "لہور لہور" کی رٹ لگائے رہے۔ لاہور کے ایک ایک ادیب، ایک ایک شاعر کے بارے میں تفصیل سے پوچھا، پھر لاہور کی سڑکوں کی جانب متوجہ ہوئے پوچھا وہ روڈ کیسی ہے، وہ گلی کیسی ہے۔ کیا انار کلی پر اب بھی شام کو رونق لگتی ہے۔ اور یار وہ ایک نیواڑی ہوا کرتا تھا کیا وہ اب بھی زندہ ہے۔ نہ جانے وہ کیا کیا پوچھتے رہے۔ مگر جب انھوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ سوال پوچھا کہ "یار! یہ بتا کہ انار کلی کے چوراہے پر ایک بھوری گائے بیٹھا کرتی تھی میں اسے روز روٹی کھلایا کرتا تھا کیا وہ اب بھی وہاں بیٹھتی ہے؟"

اس سوال کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب لاہور سر سے اُونچا ہو گیا ہے لہٰذا میں نے حضرت کو ٹوکتے ہوئے کہا "قبلہ! وہ گائے تو انارکلی میں چر رہی ہے بہ ضرور بیٹھتی ہو گی مگر کم از کم اب تو آپ یہاں سے اُٹھیئے دفتر کیلئے دیر ہو رہی ہے"۔

بادل ناخواستہ وہ اُٹھے مگر "لہور" "لہور" کی گردان کرتے چلتے رہے۔

دوسرے دن میں نے ان کے بچپن کے دوست بلراج ورما سے کہا "ورماجی یہ فکر صاحب ہمیشہ "لہور لہور" کیا کہتے رہتے ہیں"۔

یہ سنتے ہی ورماجی نے کہا "کیا کہا! لاہور!"

میں نے کہا "جی نہیں فکر تونسوی!"

وہ بولے "ارے صاحب! لاہور کی کیا بات ہے لاہور تو بس لاہور ہے۔ وہاں کا سورج ہی اور ہے، چاند ہی الگ ہے۔ وہاں پانی ایسے نہیں بہتا جیسے یہاں بہتا ہے"۔

اس پر میں نے کہا "اب بس کیجیے، میں جانتا ہوں کہ وہاں چڑیاں ایسے نہیں چہچہاتیں جس طرح یہاں چہچہاتی ہیں"۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لاہور شہر نہیں ہے ایک مرض ہے اور وہ بھی متعدی۔ جس کے سامنے ذکر کیجیے وہ ہذیان بکنے لگتا ہے۔

ہاں تو میں حضرت قبلہ کا ذکر کر رہا تھا۔ حضرت قبلہ نے اس دنیا میں آکر کوئی کام کیا ہے تو بس یہی کہ بیٹھے فقرے ڈھالتے رہتے ہیں کسی نے انہیں کچھ کہہ دیا اور انہوں نے ایک فقرہ نکال کر اُس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سماج نے ان کے خلاف کوئی زیادتی کی اور انہوں نے سماج کے خلاف ایک زوردار

بھیڑ کتا ہوا طنزیہ فقرہ نکال دیا اور مطمئن ہو گئے ۔

انھیں جب بھی دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے گاؤں کا وہ مجذوب یاد آجاتا ہے جو دن بھر پاگلوں کی طرح گھومتا رہتا تھا ہم بچوں کی طبیعت موج میں ہوتی تو ہم میں سے کوئی جاکر اسے چھیڑ دیتا تھا۔ اس پر وہ ایک گندی گالی ہم لوگوں کی طرف پھینک دیتا تھا۔ ہم لوگ خوش ہو کر تالیاں بجاتے اور وہ ایک اور زبردست گالی ہماری طرف اچھال دیتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ وہ ایک سے ایک اعلیٰ و ارفع گالی ہمیں دیتا۔ پھر ہم میں سے کوئی شریر بچہ اسے پتھر دے مارتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجذوب زور زور سے چیخنے اور رونے لگ جاتا۔ اس کی چیخوں کو سنتے ہی ہمارے ہاتھوں سے پتھر خود بخود چھوٹ جاتے۔ ہم حیرت سے اسے دیکھتے رہتے پھر رفتہ رفتہ ہماری آنکھیں بھی بھیگ جاتیں۔ پھر ہم میں سے کوئی اس کے لئے روٹی لاتا کوئی اس کے لئے پانی لاتا۔ کوئی اسے سگریٹ دیتا اور وہ پاگل پھر سے ہنسنے لگتا۔

نہ جانے کیوں میں اپنے ذہن میں فکر تونسوی کا تقابل اس مجذوب سے کرنے لگ جاتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ فکر تونسوی کو جب بھی سماج چھیڑتا ہے تو وہ ایک طنزیہ فقرہ اس کی طرف اچھال دیتے ہیں۔ فقرے نکالتے نکالتے اب ان کا طنز ایک چیخ بن گیا ہے لیکن مجھے دکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ جب گاؤں کے مجذوب کی گالی چیخ بن جاتی تھی تو ہمارے ہاتھوں سے پتھر خود بہ خود چھوٹ جاتے تھے اور ہم اس کے زخم کا مرہم بن کر اس کی طرف

دوڑ پڑتے تھے۔ فکر تونسوی کی بدقسمتی یہ ہے کہ سماج کے ہاتھوں میں پتھر جوں کے توں موجود ہیں۔ میں اس دن کا منتظر ہوں جب سماج اپنے ہاتھوں کے پتھر پھینک کر اور اپنی آنکھوں میں آنسو لاکر فکر تونسوی کی جانب بڑھے۔ اور ان کے زخموں پر مرہم رکھدے۔ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا اس وقت کے آنے تک میں یہی سمجھوں گا کہ میرے گاؤں کا مجذوب اتنا بدنصیب نہیں تھا جتنا کہ فکر تونسوی ہیں ؛؛

(سنہ ۱۹۷۵ء)

○

عمیق حنفی۔ آدمی در آدمی

حیدرآباد میں عمیق حنفی کے ایک دوست تھے مجاہد انصاری، وہ عمیق حنفی کے کچھ اتنے ناقابلِ علاج مدّاح تھے کہ ہر دوسرے تیسرے جملے کے بعد کہتے "عمیق حنفی بڑے قادر الکلام شاعر ہیں۔" اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں بھی عمیق حنفی کو قادر الکلام شاعر سمجھتا ہوں۔ لیکن قادر الکلامی کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہر دوسرے تیسرے جملہ کے بعد عمیق حنفی کا ذکر کیا جائے۔ ایک دن بات کا رُخ پھر عمیق حنفی کی قادر الکلامی کی طرف ہونے لگا تو میں نے مجاہد انصاری کو ٹوکتے ہوئے کہا "میں بھی عمیق حنفی کا قائل ہوں بلکہ تم انھیں صرف قادر الکلام شاعر سمجھتے ہو، میں تو انہیں "عبدالقادر الکلام" شاعر سمجھتا ہوں۔" اس دن کے بعد سے اُنہوں نے پھر کبھی عمیق حنفی کے سلسلے میں "قادر الکلامی" کو زحمت دینے کی کوشش نہیں کی۔

اُس وقت تک میں بھی عمیق حنفی کی جدید وجدید تعلیمیں اور غزلیں مختلف رسالوں میں پڑھ چکا تھا۔ مگر کبھی "قادر الکلامی" سے ملنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ البتہ تین چار برس میں ان کی ایک ہی مطبوعہ تصویر مختلف رسالوں میں مختلف اوقات میں نظر سے گزر چکی تھی اور یہ تصویر کچھ ایسی تھی کہ اُسے دیکھنے کے بعد عمیق حنفی سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں اس تصویر پارینہ کی بات کر رہا ہوں جس میں عمیق حنفی کا چہرہ داڑھی کی تہمت سے پاک تھا۔ آن کی تصویر کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا جیسے آپ جزیرہ نمائے عرب کے نقشے کو دیکھ رہے ہوں، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس میں کہیں کہیں عرب کا صحرا بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔ بالکل سپاٹ ساچٹانی اور کرخت چہرہ۔ ویسے اب بھی عمیق حنفی کے چہرے کے اس صحرا میں نخلستان کے اُگ آنے کے باوجود آپ آن کے چہرے کو دیکھیں تو نہ جانے کیوں جزیرۂ عرب کا خیال آجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ داڑھی کے بغیر ان کا چہرہ عرب کے جغرافیے سے قریب تھا۔ اور اب داڑھی کے بعد یہ عرب کی تاریخ اور تمدن سے قریب ہو گیا ہے۔ اور تاریخ و تمدن کی چونکہ جغرافیہ سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اِسی لئے آن کا چہرہ اب قابل قبول سا بن گیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء میں دہلی ریڈیو اسٹیشن پر "قادر الکلامی" سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ سلام مچھلی شہری نے میرا تعارف ان سے کرایا تھا۔ وہ اس وقت عجلت میں تھے۔ اور کہیں جا رہے تھے۔ تعارف کے بعد قسمت میں آن سے مصافحہ کرنا تو لکھا ہی تھا۔ مگر انہوں نے مجھ سے کچھ اس طرح مصافحہ کیا جیسے بجلی کے تار کو چھو کر جا رہے ہوں۔ ایک سکنڈ میں مصافحہ کے نام پر وہ مجھے چھو کر یوں چلے گئے جیسے

شس بین میں انہیں اپنے ہاتھوں کو دھونے کی جلدی ہو۔ وہ اپنی اُن چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی مدد سے جو بڑی مشکل سے زمین تک پہنچ رہی تھیں، تیز تیز چلتے ہوئے سے باہر نکل گئے۔ یہ تک نہیں کہا کہ "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" یہ سب ہوا اس قدر آناً فاناً ہوا جیسا کہ عام طور پر بجلی کے شاک میں ہوتا ہے کہ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ سلام مچھلی شہری نے میرے اندرونی تاثرات کو بھانپ کر ہنستے ہوئے کہا "انہیں لوگوں سے مل کر خوشی نہیں ہوتی" اور میں نے کہا "اور لوگوں کو بھی ان سے مل کر کہاں خوشی ہوتی ہے"۔

پھر ہم ریڈیو اسٹیشن کی سیڑھیوں سے اتر کر آنے لگے تو دیکھا کہ عمیق حنفی اپنے پستہ قد کو زمین سے گھسیٹتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ پستہ قد لوگوں کو میں ہمیشہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ زمین پر کم سے کم چلیں۔ قدرت نے جتنا بھی قد دیا ہے اس کی جی جان سے حفاظت کریں۔ اگر خدانخواستہ یہ کثرتِ استعمال سے گھس گھسا گیا تو زمین پر آدمی کی بجائے تڑپ چلے گی۔ غالباً اس بے لطف ملاقات کا نتیجہ تھا کہ جوں جوں انھیں اب دیکھتا گیا مجھے اُن کی چال ڈھال میں مزاحیہ گوشے دکھائی دینے لگے۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ کسی کی جسمانی ساخت کا مذاق اڑانا اچھے مزاح کا ثبوت نہیں ہے۔ مگر میں تو اس وقت اندر سے جلا بھنا تھا۔ کبھی کبھی بیسویں صدی کے آدمی میں دو ہزار سال پہلے کا آدمی بھی تو جاگ پڑتا ہے۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں جب میں مستقل طور پر دہلی آگیا تو مجھے احساس تھا کہ دہلی میں بجلی کا ایک شاک بھی موجود ہے۔ قسمت کا کھیل دیکھئے کہ میں افسانہ نگار آمنہ

ابوالحسن کے کرزن روڈ والے مکان میں رہنے لگا تو پتہ چلا کہ عمیق حنفی کا گھر بھی اسی روڈ پر ہے۔ اور یہ کہ وہ مجھ سے STONE THROW فاصلہ پر رہتے ہیں اس STONE THROW فاصلہ کو ناپنے کے لئے کبھی کبھی واقعی جی چاہا کر پتھر پھینک کر تو دیکھوں کہ آیا یہ عمیق حنفی کے لگتا ہے یا نہیں۔ اب بھلا بتائیے یہ کیسے ممکن تھا کہ دو آدمی ایک ہی روڈ پہ رہتے ہوں اور کبھی اُن کا آمنا سامنا نہ ہو۔ یوں بھی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ابتدا میں کئی دنوں تک جب بھی مجھے سامنے سے "جزیرۂ عرب" آتا ہوا دکھائی دیتا تو میں فوراً نیواڑی کی دکان پر سگریٹ خریدنے کے لئے چلا جاتا اور جزیرۂ عرب کے گزرنے تک سگریٹ ہی خریدتا رہتا۔ لیکن ہر آدمی کی ایک قوتِ خرید بھی ہوتی ہے۔ ایک دن بالآخر اُن سے ملنا ہی پڑا۔ البتہ احتیاط یہ برتی کہ مصافحہ نہیں کیا۔ پھر اُن سے بغیر مصافحہ والی باضابطہ ملاقاتیں ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ مجھے اُن سے مل کر خوشی ہونے لگی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ انہیں بھی مجھ سے مل کر خوشی ہوتی ہے یا نہیں۔ یوں بھی آج کی دنیا میں خوشی کے معاملے میں آدمی کو خود غرض ہونا چاہیئے۔ دوسرے کی خوشی جائے بھاڑ میں، ہمیں کیا لینا دینا۔

مجھے ان تین برسوں میں عمیق حنفی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ عمیق حنفی اصل میں کئی اچھے برے عمیق حنفیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ شاعر عمیق حنفی، تاریخ داں عمیق حنفی، فلسفہ شناس عمیق حنفی، ناقد عمیق حنفی، ریڈیو فیچر نگار عمیق حنفی، ہندی اور سنسکرت کے ماہر عمیق حنفی، مذہب پرست عمیق حنفی، سیکولر عمیق حنفی، مُنھ پھٹ عمیق حنفی، مقروض عمیق حنفی، پریشان حال عمیق حنفی،

عجیب عمیق حنفی، غریب عمیق حنفی. جس شخص کی ذات میں اتنے سارے عمیق حنفی ہوں۔ اس سے ملتے ہوئے عموماً بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں "شاعر عمیق حنفی" سے ملنے گیا تو دیکھا کہ "مترجم عمیق حنفی" بیٹھے ہیں۔ کبھی ناقد عمیق حنفی سے ملنے کے ارادہ سے نکلا اور ملاقات ہوئی مذہب پرست عمیق حنفی سے۔ ایک آدمی کی ذات میں اتنے سارے آدمی بیٹھے ہیں کہ مجھے سالم عمیق حنفی کچھ OVER POPULATED — سے لگتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد عموماً اس قسم کے انسانوں کی نسل ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ غلطی سے دو چار پیدا ہو جاتے ہیں تو بالآخر لوگ ان کا بھی "عمیق حنفی" بنا ڈالتے ہیں۔ ادب، فلسفہ، آرٹ، سیاست، تاریخ، تنقید، لسانیات اور مذہب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس کے بارے میں عمیق حنفی ضروری اور غیر ضروری، جائز اور ناجائز، اہم اور غیر اہم معلومات نہ رکھتے ہوں۔ آدمی جب "ریفرنس لائبریری" بن جائے تو پھر لوگ اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو عموماً لائبریریوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میرے اور عمیق حنفی کے ایک مشترکہ دوست ہیں جنہیں "علم" حاصل کرنے کا نہ صرف شوق بلکہ ہو کا سا ہے۔ جب تک دہلی میں رہے، ہر دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے اور کہتے "چلو یار! آج ذرا عمیق حنفی سے اکتساب علم کریں۔ تین دن سے دماغ میں ایک بھی نیا خیال نہیں آیا"۔ ڈیڑھ سال تک وہ دہلی میں رہے اور وہ وقفہ وقفہ سے عمیق حنفی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے رہے۔ اور جب جانے لگے تو اپنا زانو اپنے ساتھ لے گئے اور ادب کو پھر عمیق حنفی کے پاس چھوڑ گئے۔

بحیثیت شاعر میں عمیق حنفی کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ کبھی ملنے والوں کو اپنے شعر نہیں سناتے۔ دوسروں کی بات چھوڑیئے مجھے شبہ ہے کہ وہ خود کو بھی اپنے شعر نہیں سناتے ہوں گے۔ ورنہ میں نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جو "سلام علیکم" کا جواب "عرض کیا ہے" سے دیتے ہیں۔ ان تین برسوں میں ایک واقعہ بھی مجھے ایسا یاد نہیں جب عمیق حنفی نے خود سے اپنا کوئی شعر سنایا ہو۔ انہیں شعر سنانے پر آمادہ کرنے کے لئے عموماً وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو شیر کے شکار کے لئے شکاریوں کو خصوصاً شیر کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے جب کبھی اُن کی نظمیں سننے کا موقع ملتا ہے تو میں اکثر دوستوں سے کہتا ہوں "بھئی! ہم کل شکار پہ گئے تھے۔ عمیق حنفی کی دو نظمیں مار لائے"۔

عمیق حنفی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہمیشہ غلط موقع پر صحیح رائے دیتے ہیں۔ اور نتیجہ میں اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر لیتے ہیں۔ اس معاملہ میں انہیں ایسا ملکہ حاصل ہے کہ اچھی خاصی فضا کو آن کی آن میں درہم برہم کر دیتے ہیں۔ زندگی کے ۴۵ برس گزارنے کے باوجود انہیں نیک نامی حاصل کرنے کا یہ آسان گر نہیں آیا کہ ہمیشہ صحیح موقع پر غلط رائے دی جائے۔ اسی لئے بہت سے ادیب اور شاعر ان سے کبھی اپنے بارے میں انکی رائے نہیں پوچھتے۔ دور کیوں جائیے خود میرا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے۔ میں نے آج تک اُن سے کبھی اپنے بارے میں رائے نہیں پوچھی۔ البتہ ایک بار جب میری کتاب چھپ کر آئی تو میں نے بالواسطہ طور پر اُن کی رائے جاننے کے لئے ایک ترکیب نکالی اور

اُن سے خواہش کی کہ وہ اُس کی رسم اجرا انجام دیں۔ اُنہوں نے رسم اجرا تو انجام دی مگر رائے ہرگز نہ دی۔ اُن کی تقریب میں ہر طرف تقریر ہی تقریر تھی، رائے بالکل نہیں تھی۔ اُن کی تقریر سے رائے کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسے روئی کے ڈھیر میں سوئی کو تلاش کیا جائے۔ پھر بھی ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے ہمارے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ یہی بہت بڑی بات ہے، ورنہ صحیح رائے دینے کے معاملہ میں وہ نو مسلموں کا سا جوش و حوصلہ رکھتے ہیں۔ ایک بار ایک افسانہ نگار نے انہیں اپنا افسانہ سنایا۔ افسانہ ختم ہوا تو افسانہ نگار نے عمیق حنفی کی رائے پوچھی۔ عمیق حنفی نے افسانہ نگار سے کہا: پہلے اپنا دایاں ہاتھ افسانہ کی دائیں جانب رکھئے اور پھر بایاں ہاتھ بائیں جانب پھر افسانہ کو زور سے پکڑ کر بائیں ہاتھ کو مضبوطی سے اپنی جگہ پر قائم رکھئے اور دایاں ہاتھ افسانہ سمیت اپنی طرف کھینچئے۔ عمیق حنفی کی اِس پیچیدہ رائے کا آسان مطلب یا ترجمہ یہ تھا کہ افسانہ کو پھاڑ دیجئے۔ اپنے سامنے بیچارے افسانہ نگار سے اُس کے افسانہ کے پرزے پرزے کروائے۔ پھر ازراہِ احتیاط یہ بھی پوچھ لیا کہ کہیں تمہارے گھر میں اِس کی نا نقل کاپی تو نہیں ہے۔ نفی میں جواب ملا تو یوں مطمئن ہوگئے جیسے ادب پر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔

بہت سے شاعر اور ادیب ان کی شاعری اور علمیت سے متاثر ہو کر اُن کے پاس اپنے کلام کے مجموعوں کے مسودے اِسلئے بھیجتے ہیں کہ وہ اُن پر "مقدمہ" لکھدیں۔ پہلے یہ مسودے منگوا لیتے ہیں۔ اُن پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ پھر مسودے کو ایسی محفوظ جگہ رکھ دیتے ہیں جہاں کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ بیچارے عرضمند

شاعر اور ادیب بہت دنوں تک ان سے "مقدمہ" مانگتے ہیں، وہ انہیں نہیں دیتے پھر آخر میں جب شاعر تھک ہار کر اپنا مسودہ مانگتا ہے۔ تو وہ بھی اُسے نہیں دیتے۔ میں نے بہت سے شاعروں کو ان کے گھر "مقدمہ" اور "مسودے" کے پھیر میں چکر لگاتے دیکھا ہے۔ بعض اوقات تو عمیق حنفی کے قرض خواہوں اور مسودوں کی واپسی کے متمنی شاعروں میں تمیز کرنا تک دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے مانگنے کا انداز ایک ایسا ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں عمیق حنفی کا استدلال یہ ہے کہ ناقابل اشاعت کلام کو اگر ہر مقدمہ نگار "مقدمہ" کے اسٹیج پر ہی روک لے تو ادب میں اتنی افراتفری نہیں پھیلے گی۔

عمیق حنفی جب بھی کسی شاعر کا خراب کلام سنتے ہیں تو اُن کی رائے زبان پر آنے سے پہلے اُن کے چہرے پر نمودار ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے ارنڈی کا تیل پی رکھا ہو۔ غلط بات، غلط حرکت اور غلط خیال پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے بلی چوہے پر۔ اس سے عمیق حنفی کو ایک فائدہ ضرور حاصل ہوا ہے کہ ہر ایرا غیرا انہیں اپنا کلام نہیں سناتا۔

اُن کے سماجی رویے بھی عام آدمی کے رویوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اُن کے رویوں کے بارے میں قبل از وقت اندازہ لگانا بہت مشکل کام ہے اس معاملہ میں انکی حالت اس جاٹ لاری ڈرائیور کی سی ہوتی ہے جو ہاتھ دکھائے بغیر اچانک اپنی لاری سیدھی جانب یا بائیں جانب موڑ دیتا ہے۔ ابھی دو برس پہلے کی بات ہے کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اُن کی ایک کتاب کو ڈیڑھ ہزار

روپئے کا انعام دینے کا اعلان کیا۔ دن میں مجھے اس کی اطلاع ملی اور شام میں کناٹ پلیس پر عمیق حنفی مل گئے۔ اب ایسے موقعوں پر ایک نارمل آدمی دوسرے نارمل آدمی کو مبارکباد تو دیتا ہی ہے۔ لہٰذا میں نے انہیں انعام کی مبارکباد دیدی۔ اس کے جواب میں ان کے چہرے پر اچانک ایسے آثار نمودار ہونے لگے جو عموماً مرگی کے مریض کے چہرے پر مرض کے حملے کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔ پھر یکایک انہوں نے ہاتھ بتلائے بغیر اپنی لاری کو موڑتے ہوئے کہا "گالی دینے کے اور بھی کئی مہذب طریقے شرفائے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اس انعام کی مبارکباد دے کر مجھے گالی کیوں دے رہے ہو"۔ اب میں حیران کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی، البتہ ان کے ساتھ جو دوست اس وقت موجود تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ موصوف نے از راہ کرم اتر پردیش اردو اکیڈمی کو یہ انعام واپس کر دیا ہے۔ جب ہم کناٹ پلیس سے واپس ہونے لگے تو عمیق حنفی نے مجھ سے کہا "بھئی میں شدید مالی بحران سے گزر رہا ہوں۔ آپ کچھ بندوبست کیجئے"۔ میں نے کہا "قدرت آپ کے لئے بندوبست کرنا چاہتی ہے مگر آپ کو یہ بندوبست منظور نہیں ہے۔ میں بھلا کیا بندوبست کر سکتا ہوں"۔ لاکھ سمجھایا کہ فی الحال اس انعام کو لے کر اپنے مالی بحران اور قرض خواہوں کا منہ بند کیجئے۔ بعد میں اتر پردیش اکیڈمی کو قسطوں میں یہ انعام واپس فرما دیجئے گا۔ اکیڈمی آپ سے سود بھی نہیں لیگی۔ بولے "مانا کہ اکیڈمی سود نہیں لے گی۔ لیکن مجھے "ڈیڑھ ہزاری منصب داروں" کے زمرے میں کھڑا کر دیگی۔ یہ سود سے زیادہ نقصان دہ سودا ہے۔ قرض خواہ سے

قرض لینے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ صرف سود سے مطلب رکھتا ہے میری ادبی قدوقامت کے راستے میں حائل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد وہ قرض خواہ اور اترپردیش اردو اکیڈمی کے فوائد و نقصانات کی طویل فہرست کچھ اس طرح پیش کرتے رہے جیسے جغرافیہ کے پرچے میں دکن کے دریاؤں اور شمالی ہند کے دریاؤں کا تقابل کر رہے ہوں۔ بعد میں وہ شدید مالی بحران سے گزرتے رہے لیکن انعام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

تبل اس کے کہ میرا حافظہ کمزور ہو جائے یہاں اُن کی یادداشت کی جانب بھی کچھ اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ غیر شخصی واقعات کو اُن کا حافظہ بڑی خوشی سے قبول کر لیتا ہے اور شخصی واقعات کو قبول کرنے کے معاملہ میں ان کا حافظہ بالکل اڑیل ٹٹو بن جاتا ہے۔ انہیں عربوں کے ہندوستان آنے کی تاریخ، رومیوں کے زوال کے اسباب اور دنیا بھر کے فلسفیوں کے نظریات تو اچھی طرح یاد رہتے ہیں، لیکن انہیں کسی دوست کے اپنے یہاں آنے کی تاریخ، خود اپنے زوال کے اسباب اور اپنے ہی لکھے ہوئے شعر یاد نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی صاحب سے بڑی گرم جوشی سے مل تو بیٹھتے ہیں لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جسے انجینئر سمجھ کر مل رہے تھے وہ بعد میں ڈاکٹر بن گیا۔

ایک بار حیدرآباد سے ایک نوجوان اُن سے ملنے آیا۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ وہی نوجوان ہے جس نے حیدرآباد میں قیام کے دوران اُن کی بڑی خاطر مدارات کی تھی۔ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ پھر شکایت کی کہ آپ نے خط نہیں لکھا

نوجوان نے حیرانی سے پوچھا "حنفی صاحب! آپ نے مجھے پہچانا ہے؟" بولے "کیسے نہیں پہچانوں گا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ سے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی تھی"!

اس پر نوجوان نے کہا "صاحب! میں آپ کے حافظہ کی داد دیتا ہوں۔ حیدرآباد میں جس جلسہ کو آپ نے مخاطب کیا تھا اس میں سننے کی ایک نشست پہ میں بیٹھا تھا۔ آپ سے دو ایک بار نظریں چار ہوئی تھیں۔ پھر جلسہ کے بعد جب آپ جانے لگے تو میں نے بھیڑ میں آپ سے مصافحہ بھی کیا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس کے باوجود آپ نے مجھے یاد رکھا۔ ایسا تیز حافظہ میں نے بہت کم لوگوں کا دیکھا ہے۔" نوجوان کہے جا رہا تھا اور عمیق حنفی بڑے معصوم بنے اپنے حافظہ کی تعریف کی داد وصول کر رہے تھے۔ اور شاید دل ہی دل میں پشیمان بھی ہو رہے تھے کہ کس کی گرمجوشی کس کو دیدی۔

عملی زندگی میں بھی یہ بڑی اول جلول حرکتیں کرتے ہیں۔ مجھے پتہ نہیں یہ دلی میں کتنے برس رہ چکے ہیں لیکن انہیں دہلی کے راستے بالکل نہیں معلوم۔ اسی لئے جنوبی دہلی جانے کے ارادے سے نکلتے ہیں تو شمالی دہلی میں پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ کہیں جانا ہو تو جانے سے پہلے اپنے اوپر سراسیمگی طاری کر لیتے ہیں۔ سراسیمگی ان کے لئے "سامانِ سفر" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سراسیمگی کے تحت ایک بار وہ بھوپال جانے کے لئے نکلے تو اپنے گھر کی مانوس سڑک کو عبور کرنے کے فوراً بعد ایک راہ گیر سے پوچھ بیٹھے "کیوں بھئی! کیا بھوپال کو یہی راستہ جائیگا؟" ہوں جس کا عنوان

اس سراسیمگی کا ایک اور واقعہ سن لیجئے کہ پچھلی سردیوں میں اُنہیں "اقبال سیمینار" میں شرکت کے لئے حیدرآباد جانا تھا۔ ریل کے ٹکٹ کا ریزرویشن یہ بالکل نہیں کرا سکتے۔ اس لئے میں نے بھاگ دوڑ کر کے ریزرویشن کروا دیا۔ پھر یہ سوچ کر کہ کہیں یہ کرزن روڈ کے نکڑ سے ہی حیدرآباد کے راستہ کا پتہ نہ پوچھنے لگ جائیں خود اسٹیشن گیا۔ نشست پر بٹھایا اور واپس چلا آیا۔ حیدرآباد میں اُنہوں نے بہت زوردار مقالہ پڑھا۔ جب دہلی واپس آئے تو میں اُن سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ بہت اُداس بیٹھے ہیں۔ اُداسی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "یار! راستہ میں کسی نے میرا سوٹ کیس چرا لیا۔ اسی میں میرا واحد سوٹ بھی رکھا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اقبال پر جو مقالہ لکھا تھا وہ محفوظ رہ گیا"۔ پھر کچھ دیر ادھر اُدھر کا حساب کرنے کے بعد بتایا "تب بھی یہ سفر نقصان میں نہیں پڑا۔ کیونکہ سیمینار والوں نے ۹۰۰ روپئے دیئے تھے اور جو سامان چوری گیا ہے اس کی مالیت ۸۹۰ روپئے کی ہوتی ہے۔ دس روپئے کا تو پھر بھی فائدہ رہا"۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے وہ کاغذ میری جانب بڑھا دیا جس پر اُن کے پرانے سوٹ کیس، پرانے سوٹ، پرانے تولیہ اور اقبال پر ان کے بعض پرانے مضامین کی رائج الوقت قیمتیں درج تھیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی بربادی کا جواز بھی خود ہی ڈھونڈتے ہیں اور جب جواز ملتا ہے تو یوں خوش ہو جاتے ہیں جیسے "گوہر مقصود" حاصل ہو گیا۔

عمیق حنفی کو جب بھی میں نے دیکھا، مالی پریشانیوں میں مبتلا دیکھا۔ انکی ایک تہائی مالی پریشانیاں قدرت کا عطیہ ہوتی ہیں، مگر بقیہ تین چوتھائی پریشانیاں

اُن ہی کی "مرہونِ منت" ہوتی ہیں۔ جو آدمی صرف۔ تفریق ہی تفریق جانتا ہو اور جمع کے قاعدہ سے بالکل واقف نہ ہو اُسے معاشیات کی اصطلاح میں "فضول خرچ آدمی" کہتے ہیں۔ لطف یہ کہ اُن کی مالی پریشانیاں بھی جاری رہتی ہیں اور دوستوں کی مہمان نوازی بھی۔ صبح یہ مالی بحران میں مبتلا ہونگے۔ اور شام میں آپ اُن کے یہاں جائیں تو دیکھیں گے کہ کسی دوست کی پُر تکلف ضیافت ہو رہی ہے۔

یہ بحث بہت دنوں سے چل رہی ہے کہ عمیق حنفی جدید ہیں یا ترقی پسند۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ البتہ میں نے انہیں ہر دو فریقین سے بے تحاشہ لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو مکھی لڑائی۔ میں سمجھتا ہوں جدیدیت اور ترقی پسندی عمیق حنفی کے لئے ذیلی باتیں ہیں۔ اصل اہمیت تو لڑائی کی ہے۔ آدمی کو ہمیشہ لڑتے رہنا چاہئے۔

شاعری کے معاملہ میں بھی وہ چومکھے پن کے قائل ہیں۔ انکی نظموں میں جہاں عریاں اشارے ملیں گے وہیں خالص مذہبی رنگ بھی ملے گا۔ اسلئے میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ عمیق حنفی کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے نہ صرف "بصارت" کی بلکہ "بصیرت" کی بھی ضرورت ہے۔ میرا اشارہ اُن کی مشہور زمانہ نظم "صلصلة الجرس" کی طرف ہے۔

عمیق حنفی کی ایک ادا مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ وہ یہ کہ وہ ادب اور زندگی دونوں میں کہیں اپنے ضمیر کو بیچا پسند نہیں کرتے۔ اور ادب اور زندگی دونوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرتے ہیں۔ اُن کی کمائی اور اُن کا بینک بیلنس بس یہی ضمیر ہے۔ ورنہ اِن دنوں تو انسانوں میں خالص ضمیر کا ملنا بہت دشوار ہے۔ میں آخر میں اِس خاکہ کو عمیق حنفی کی ایک نظم پہ ختم کرنا چاہتا ہوں جس کا عنوان ہے۔

"کاش آئے ایسی شام" ____

اے مرے ساتھی
میں ترا خاکہ اڑاؤں
اور تو بن جائے میرا کارٹون
تو کوئی جوسی سا گاسپ (Gossip) چھیڑ دے
میں تجھے کچھ چٹ پٹی غزلیں سناؤں
دونوں مل کر بے سُری تانیں لگائیں
قہقہوں سے چھید ڈالیں ہم اداسی کا بدن
اور لے لیں شام سے پژمردگی کا انتقام
کاش آئے ایسی شام
اور میرا ایسا خیال ہے کہ عمیق حنفی کی نظم کی وہ شام آج آئی ہے۔

(۱۹۷۵ء)

○

رضا نقوی واہی

ان سے ملیے۔ یہ ہیں رضا نقوی واہی۔ اردو کے مشہور طنزیہ و مزاحیہ شاعر
نھیں ذرا الٹ پلٹ کر غور سے دیکھیے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سے
ی وقت گھبرانا چاہیے جب ان کے ہاتھ میں قلم ہو۔ اس وقت تو یہ نہتے بیٹھے ہیں۔
پ کو حساب تو آتا ہو گا۔ ان کی ذات میں سے قلم کو منہا کر دیا جائے تو جواب صفر
ئے گا۔

یہ پٹنہ میں پائے جاتے ہیں۔ پٹنہ ہندوستان کا واحد شہر ہے جس کے کئی
رجمے رائج ہیں۔ پٹنہ کا فارسی ترجمہ عظیم آباد اور سنسکرت ترجمہ پاٹلی پتر ہے۔
پٹنہ خورد کس کا ترجمہ ہے یہ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔ ہم پہلے سمجھتے تھے کہ یہ تینوں
ام تین مختلف شہروں کے ہیں لیکن ایک بار خود پٹنہ گئے تو پتہ چلا کہ ہم ایک ہی ٹکٹ

ہیں بیک وقت تین شہروں میں پہنچے ہوئے ہیں۔ ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا
شہر تو سیدھا سادا ہے۔ ہم یہاں کہیں نہیں بھٹکے لیکن اس کے ترجمے کی بھول
میں کئی دن بھٹکتے رہے۔

ہم واہی صاحب کو پچھلے نو دس برسوں سے جانتے ہیں۔ اس سے پہلے ا
کا کلام پڑھتے تھے اور اپنے سر کو اس زور سے دھنتے تھے کہ گردن میں درد تھم
ہو جاتا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر نے منع کیا تو سوچا ان سے شخصی ملاقات کی جائے۔ ان سے
پٹنہ اور حیدرآباد میں ہماری ملاقاتیں رہی ہیں۔ لیکن واہی صاحب کے سلسلے میں شخص
ملاقاتوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ہمیں اکثر ایسے خط لکھتے رہے ہیں
جن کے جواب دینے کی نہ ہم میں تاب ہے نہ مجال۔ آپ جانتے ہیں کہ واہی صاحب
بہت اچھے منظوم خط "کہتے" ہیں۔ آپ کو ہماری گرامر پر اعتراض ہوگا کہ خط تو لکھے جاتے
ہیں کہے نہیں جاتے۔ یہ ہماری گرامر کا نہیں واہی صاحب کے خطوں کا قصور ہے۔ جب
نظم کہی جاتی ہے، غزل کہی جاتی ہے تو منظوم خط بھی کہے جاتے ہیں لکھے نہیں جاتے۔
۱۹۶۸ء کے اوائل میں ان کا پہلا منظوم خط ہمیں ملا تھا۔ اس خط کو پا کر ہم کئی دن پریشان
رہے کہ انھیں کیسے جواب دیں کیونکہ ہم ہمیشہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی
رہے ہیں اور یہاں ہمارا یہ حال تھا کہ "نہ ردیف کی خبر ہے نہ قافیہ معلوم"۔

ایک دوست کے ذریعہ زبانی پیغام ان تک پہنچایا کہ اگر طبع نازک پر گراں
نہ گزرے تو ہمیں نثر میں جواب دینے کی اجازت دی جائے۔ ہم نے کہلوایا کہ آدمی
کبھی کبھی نثر بھی لکھنی چاہیے۔ یوں اچھی بھلی زندگی کو آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ بنانے

کیا فائدہ۔ انھوں نے ہمیں نثر میں جواب دینے کی اجازت تو دیدی مگر جواب نجینے کا مزہ نہ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے منظوم خطوں کے جواب نہیں دیتے جس کے نتیجہ میں وہ ہم سے ناراض ہو جاتے ہیں اور ناراض ہو کر پھر ایک منظوم خط ہمیں "ارشاد" کر دیتے ہیں۔

ایک بار انھوں نے ہمیں ایک منظوم خط لکھا۔ ہم نے خط لکھ کر ان سے پوچھا کہ یہ خط جو آپ نے ہمیں بھیجا ہے وہ "مطبوعہ" ہے یا "غیر مطبوعہ"؟ جواب آیا "فی الحال تو غیر مطبوعہ ہے"۔ چونکہ اس خط میں ہماری تعریف تھی اس لئے ہم نے اسے ماہنامہ "صبا" میں چھپوا دیا۔ بعد میں ان کے منظوم خط کی تعریف میں ہمارے پاس کئی خط آئے تعریفی خطوں کو تو ہم نے خوشی خوشی قبول کیا۔ لیکن ہمارے حلقہ کے ڈاکئے صاحب جو خود بھی شاعر واقع ہوئے تھے ایک دن شکایتاً کہنے لگے "صاحب آپ کے ہاں واہی صاحب کے منظوم خط آتے ہیں اور ہم ہی یہ خط آپ تک پہنچاتے ہیں لیکن آپ ہمیں ان خطوں کی چاشنی سے محروم کیوں رکھتے ہیں؟" ہم نے کہا "میاں، جب بھی واہی صاحب کا خط آئے تو چلے آنا۔ ہم تمہیں سنا دیں گے۔ واہی صاحب کے ان خطوں میں ہمارے لئے تو کچھ بھی نہیں ہوتا بڑے بے ضرر خط ہوتے ہیں۔ ان میں ہمارا خیال کم اور ردیف وقافیے کا خیال زیادہ رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سارے خط قابلِ اشاعت ہوتے ہیں سچے اور اصلی خط کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ ناقابلِ اشاعت ہوتا ہے۔ مرزا غالب، مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو سے لے کر واہی صاحب تک کے خطوں کی خرابی یہ ہے کہ یہ چھپنے کے ارادے سے لکھے گئے تھے۔ یہ خط تو ساری قوم کی ملکیت

ہوتے ہیں۔ مکتوب الیہ تو خواہ مخواہ بدنام ہوتا ہے۔" ڈاکیے نے ہماری بات پر اس حد تک یقین کر لیا کہ جب بھی واہی صاحب کا کوئی خط ہمارے نام آیا تو اس نے قوم کی ملکیت سمجھ کر پڑھ لیا اور خود کو قوم سمجھ کر واہی صاحب کو جواب دیدیا۔ اس طرح ہمارا کام کافی آسان ہو گیا۔

آج ہم ایک راز کا افشا بھی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جو ہم ان دنوں خاکہ نگاری کر رہے ہیں بلکہ خود واہی صاحب کا خاکہ لکھ رہے ہیں تو اس کی اصل وجہ خود واہی صاحب کا ایک منظوم خط ہے۔ بات یوں ہوئی کہ ۱۹۶۸ء میں جب ہم نے حکیم یوسف حسین خاں پر پہلا خاکہ لکھا تھا تو اس کی توصیف میں واہی صاحب نے ایک منظوم خط بھی لکھا تھا۔ جس کے کچھ اشعار آپ کو بھی سنائے دیتے ہیں اس لیے کہ ان میں ہماری تعریف ہے۔

یوسف حسین خاں کی تصویر کھینچ کر
تم نے نشان بلند کیا اپنے آرٹ کا

ہنستے ہنساتے راز سبھی فاش کر دیئے
کہتے ہیں اس کو خاکہ نگاری کا معجزا

اس درجہ خوش ہوا ہوں کہ در عالم خیال
کتنی ہی بار تم کو گلے سے لگا لیا

یہ تو بتا دوستن کے یہ مضمون لاجواب
یوسف حسین خاں کا ردِّ عمل تھا کیا

ہماری خاکہ نگاری پر یہ پہلا تبصرہ تھا بلکہ منظوم تبصرہ تو آج تک بھی پہلا ہے۔

اس ہمت افزائی نے ہمیں اس درجہ گمراہ کیا کہ آج تک خاکہ نگاری کئے چلے جارہے ہیں۔ ذرا سوچیئے واہی صاحب کتنے دور اندیش آدمی ہیں۔ اپنے اوپر خاکہ لکھوانے کے لیے دس سال پہلے حکیم یوسف حسین خاں پر لکھے ہوئے ہمارے خاکے کی تعریف کی تھی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تعریف کے اس پردہ زنگاری میں واہی معشوق بنے بیٹھے ہیں۔ اگر واہی صاحب کبھی آپ کی ہمت افزائی کریں تو ہوشیار ہوجایئے کہیں آپ کو بھی خاکہ نہ لکھنا پڑجائے۔

واہی صاحب کو ایک بار ہم نے حیدرآباد بلایا تھا۔ بڑی مشکل سے آئے عذر یہ پیش کرتے تھے کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی صحت کی خرابی کا اعلان کچھ اس زور و شور سے اور تفصیل سے کیا تھا کہ ہم اسٹریچر لے کر انھیں لینے اسٹیشن پہنچے بلکہ ایک ڈاکٹر بھی حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے ساتھ رکھا۔ یہ ٹرین سے اترے تو دیکھا کہ ایک نہایت صحت مند آدمی سامنے کھڑا ہے سخت مایوسی ہوئی۔ اسٹیشن سے واپسی میں ہم اسٹریچر پر آئے اور وہ ٹیکسی میں۔ جتنے دن حیدرآباد میں رہے دھما چوکڑی مچاتے رہے۔ سمجھ ہی نہیں آیا وہ کب بیمار رہتے ہیں۔ کیسے بیمار رہتے ہیں۔ کیا بیمار رہتے ہیں۔ یکمشت بیمار رہتے ہیں یا قسطوں میں بیمار رہتے ہیں۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران میں ایسی صحت مند حرکتیں کیں کہ ہم دنگ رہ گئے۔

ان دنوں حیدرآباد میں ایک جدید شاعر رہتے تھے۔ جدید شاعری اور افسانہ نگاری میں آج بھی وہ ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں مگر اب پاکستان چلے گئے ہیں ان کی خوبی یہ تھی کہ جیسی شاعری کرتے تھے ویسا ہی اپنے آپ کو رکھتے تھے۔ حالانکہ

شاعر کے قول اور فعل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ کئی کئی دن غسل نہیں فرماتے تھے منہ دھوئے بغیر کھانا کھا لیتے تھے۔ کپڑوں کو دیکھئے تو لگتا تھا پیشہ کے لحاظ سے تیلی ہیں۔ خون اور پیپ پینا تو ان کی شاعری میں روزمرہ کا معمول تھا۔ واہی صاحب کی ان سے حیدرآباد میں ملاقات ہو گئی۔ اب واہی صاحب نے ان میں دلچسپی لینی، جو شروع کی تو ہم سب حیران کہ آخر واہی صاحب کو جدید شاعری سے ایسا والہانہ لگاؤ کیونکر ہو گیا۔ سارا سارا دن اپنے "موضوعِ سخن" کو ساتھ رکھتے۔ نہ یہ پٹنہ واپس جاتے تھے نہ جدید شاعر کو اپنے سے جدا ہونے دیتے تھے۔ بارِ خدا ایک دن تنہائی نصیب ہوئی تو عرض کیا "بندہ پرور پٹنہ میں لوگ آپ کے لئے بےچین ہوں گے۔ واپسی کا کب ارادہ ہے؟" فرمایا "آپ کے شاعر دوست کو غسل کرنے کے لئے راضی کر رہا ہوں۔ جیسے ہی غسل کی تاریخ مقرر ہو جائے گی میں اس فرض سے سبکدوش ہو کر پٹنہ واپس چلا جاؤں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں"۔ چنانچہ واہی صاحب کے پیہم تقاضوں کے بعد "موضوعِ سخن" غسل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مگر یہ غسل کوئی معمولی غسل نہیں تھا۔ اس کے لئے ایک باضابطہ تقریب منعقد کی گئی۔ واہی صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس تقریب میں شریک ہوئے بلکہ انھوں نے ہی پانی کا پہلا لوٹا "موضوعِ سخن" کے سر پہ ڈال کر غسل کا باضابطہ افتتاح فرمایا تھا۔ اس کے بعد کا سارا کام غسالوں نے انجام دیا۔ جدید شاعر کو خوب رگڑ رگڑ کر نہلایا گیا۔ کسی نے واہی صاحب کو سمجھایا کہ اُپلے کو چاہے آپ کتنا ہی نہلائیں وہ اُپلا ہی رہے گا۔ مگر واہی صاحب ارادے کے ایسے پکے نکلے کہ شاعر کو نہلا کر ہی دم لیا۔ پھر شاعر کے خوشبوئیں لگائی گئیں۔ اسے

نئے کپڑے پہنائے گئے۔ جدید شاعر کے غسل کی تقریب کے بعد واہی صاحب نے
اطمینان کا لمبا سانس لے کر کہا "اب یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے گنگا نہالی ہے۔
اب میں پٹنہ جاؤں گا۔ تاہم مجھے اطلاع دیتے رہنا کہ اس غسل کے بعد ان کی شاعری
میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔" واہی صاحب نے یہ ساری حرکت کچھ ایسی سنجیدگی
سے کی تھی اور جدید شاعر نے بھی اس سنجیدگی سے اپنے آپ کو ہمارے ہاتھوں نہلوایا
تھا کہ کئی دنوں تک یہ پتہ نہ چلا کہ واہی صاحب مذاق کر رہے ہیں یا سنجیدہ ہیں۔ بہت
دن بعد ایک دن پتہ چلا کہ مذاق کر رہے تھے۔ اس کے بعد سے ہم واہی صاحب
سے کافی چوکس رہنے لگے ہیں۔ یہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ ہمیں تو اس وقت
مایوسی ہوئی تھی جب یہ اپنی بیماری کے لگاتار اعلان کے باوجود ہمیں صحت مند دکھائی
دیتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ اپنی بیماریوں کا اعلان محض بیماریوں کے جراثیم کو
دھوکہ دینے کے لئے کرتے ہیں۔ یعنی گلے ہیں۔ بیماریوں کے سلسلے میں ہادس فل
کی تختی لگادی جائے تو جراثیم خود بخود کسی دوسرے جسم کی طرف رجوع کریں گے۔
ان کی اس صحت مندی کا نتیجہ تھا کہ پورے نو سال بعد پچھلے سال جب ہم پٹنہ
گئے تو اسٹیشن پر واہی صاحب کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ بڑی بے تکلفی کے ساتھ
ان سے گلے ملنے کے بعد کہا "واہی صاحب آپ نے اسٹیشن آنے کی زحمت کیوں
کی۔ ہم خود آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو جاتے۔" ہمیں جواب ملا "معاف کیجئے
میں واہی صاحب نہیں ہوں۔ میں ان کا بڑا لڑکا علی ہوں۔" ہم نے کہا "واہی صاحب
مذاق چھوڑیئے ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ واہی صاحب ہیں اور یہ بھی جانتے

ہیں کہ آپ بڑی سنجیدگی کے ساتھ عملی مذاق کرتے ہیں!"

پھر جواب آیا "خدارا یقین کیجئے۔ میں واہی صاحب نہیں ہوں بلکہ ان کا بڑا عملی مذاق ہوں!" وہ تو اچھا ہوا کہ بحث کے دوران میں تنقیع مشہدی آ گئے۔ انھوں نے تصدیق کی تو دل کو اطمینان آیا کہ یہ واہی صاحب نہیں ہیں۔ یوں بھی ہم ان سے تو سال ہا سال رہے تھے۔ ہوٹل میں پہنچے تو وہاں ایک اور واہی صاحب نظر آئے۔ مو خر الذکر واہی صاحب چونکہ اوّل الذکر واہی صاحب سے خاصے کم عمر نظر آتے تھے اس لئے ہم نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہی اصلی واہی صاحب ہوں گے۔ قریب گئے تو سچ مچ اصلی واہی صاحب نکلے پہلے سے کہیں زیادہ تنومند اور توانا۔ پہلے جو بال سفید تھے وہ اور کچھ کالے ہو گئے تھے چہرے پر پہلے سے کہیں زیادہ چمک نظر آتی تھی ہم نے ان کی صحت کی داد دینی شروع کر دی تو فوراً اپنی بیماریوں کی تفصیل بتانے پر اتر آئے۔

حیدرآباد میں واہی صاحب کو جدید شاعر کو غسل کراتے دیکھا تھا پٹنہ آئے تو دیکھا کہ یہاں ان کی بڑی "اندرا لہر" چلی ہوئی ہے۔ یہاں ان کی شخصیت میں ایک رکھ رکھاؤ نظر آیا کہ یوں لگا جیسے طنز و مزاح سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے انھوں نے نہ جانے یہ گر کہاں سے سیکھا ہے کہ ہر شخص سے اپنی عزت کرواتے ہیں چھوٹا بڑا موٹا دبلا، کالا، گورا ہر ایک ان کی عزت کرتا ہے کاش یہ گر ہمیں بھی آتا اور ہم بھی اپنی عزت کرانے کا مزہ لوٹتے۔ مدت ہوئی کسی سے اپنی عزت نہیں کروائی ان کی شخصیت کی خوبی یہ ہے کہ شاعر ہونے کے باوجود ان میں شرافت و نفاست

کوٹ کوٹ کر بھری ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شرارت میں بھی شرافت ہوتی ہے۔ کسی کام میں جب تک شرافت کی ملاوٹ نہیں کر لیتے تب تک اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ان سے ملنے کا ہمیں ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہمارا اور ہمارے لوگوں کے متعلق ہمیں جتنی غلط فہمیاں تھیں وہ نہ صرف دور ہوگئیں بلکہ الٹی خوش فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک آدمی کبھی کبھی کتنا بڑا کام کر جاتا ہے۔

طنز و مزاح نگار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زمانے کی دکھتی ہوئی رگوں کو پکڑ لیتا ہے۔ لیکن ہمارا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر طنز و مزاح نگار اچھی بھلی بنا دکھ والی رگوں کو اس زور سے پکڑ لیتے ہیں کہ ان میں خود بخود درد شروع ہوتا ہے اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ موصوف نے دکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ واہی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ زمانے کی دکھتی رگوں کے پیچھے حیران نہیں رہتے بلکہ اپنی ہی دکھتی رگوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔ ان کے طنز میں کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہوتی۔ واہی صاحب عرصے سے ہماری کمزوری رہے ہیں۔ اکبرالہ آبادی کی روایت کو ہندوستان میں اگر کوئی سنجیدگی سے آگے بڑھا رہا ہے تو یہ واہی صاحب ہی ہیں۔ لوگوں میں قہقہوں کی دولت بانٹنا دنیا کا شریف ترین پیشہ ہے۔ کسی مزاح نگار نے کہا ہے کہ قہقہہ لگانے سے آدمی کے سفید بال کالے نہیں ہو جاتے بس یہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد یہ سفید بال برے نہیں لگتے زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرنے کو جی چاہتا ہے کروڑوں سال پرانی دنیا میں آدمی اپنی زندگی کے ساٹھ ستر سال کس مشکل سے گزارتا ہے یہ بس اس کا دل ہی جانتا ہے ایسے میں کوئی قہقہوں کی دولت بانٹتا ہے تو ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہئے۔

(مارچ ۱۹۷۸ء)

خواجہ عبدالغفور — لطیفوں کا آدمی

پندرہ سولہ سال ادھر کی بات ہے۔ میں کالج کی چھٹیاں گذارنے کے لئے ہر سال موسم گرما میں اپنے آبائی وطن عثمان آباد کو جایا کرتا تھا۔ عثمان آباد ایک چھوٹا اور خاموش سا شہر ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ——— اس شہر میں پہنچتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی کے سارے ہنگامے ختم ہو گئے ہیں۔ اب آگے صرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔ سکون ہی سکون۔ نہ شور و غل نہ شور شرابہ۔ سارا دن رشتہ داروں کے ساتھ گذرتا۔ شام ہوتے ہی میں یا تو پہاڑیوں پر تفریح کے لئے نکل جاتا یا پھر اس لمبی سڑک پر چہل قدمی کے لئے نکل جاتا جو اس شہر کی واحد سڑک ہے۔ یہ سڑک مجھے بہت پسند تھی اور آج بھی ہے، کیونکہ جب بھی مجھے اپنے ماضی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے تو یہی سڑک مجھے اپنے بچپن کی طرف لے جاتی ہے۔ اپنے بچپن تک

پہونچنے کے لئے اس سڑک کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس لمبی سڑک سے ایک گہری وابستگی کا احساس مجھے ہوتا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس شہر میں اس اکلوتی سڑک کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔ اندھیری راتوں میں کبھی کبھی یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتا کہ اگر چور رات کے اندھیرے میں اس سڑک کو چرا کر کہیں لے گئے تو میں اس شہر سے باہر نہ نکل سکوں گا۔ ہر شام جب میں اس غیر معروف سڑک پر چہل قدمی کے لئے نکلتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے میں، اس واحد سڑک کا واحد مالک ہوں۔ کوئی مجھے اس سڑک سے بے دخل نہیں کر سکتا۔

اسی سڑک پر ایک شام میں چہل قدمی کیلئے نکلا تو راستہ میں ایک پرانا ساتھی مل گیا۔ ہم دونوں ایک بڑی کوٹھی کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے اور ہم سے کچھ فاصلہ پر اس کوٹھی کا سنتری کھڑا پہرہ دینے کی کوشش میں مسلسل اونگھ رہا تھا۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ یہ سنتری آن کی آن میں چوکس اور الرٹ ہو گیا جیسے کسی نے بٹن دبا کر اس کے بدن میں برقی رو دوڑا دی ہو۔ ابھی میں سنتری کی اچانک تبدیلی کا مطالعہ کر ہی رہا تھا کہ اس نے بڑی بلند آواز کے ساتھ ہمیں سڑک پر سے ہٹ جانے کو کہا جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میں اپنے آپ کو اس سڑک کا بلا شرکت غیرے مالک سمجھا کرتا تھا۔

•

سنتری کے اس حکم کو سن کر میرے بدن میں بھی برقی رو دوڑ گئی۔ یوں بھی سولہ سترہ سال کی عمر میں آدمی کے بدن میں بجلی زیادہ ہوتی ہے خون کم

میں نے تنک کر کہا "تم کون ہوتے ہو۔ ہمیں سڑک پر سے ہٹانے والے؟

اس نے کہا "زیادہ بکواس نہ کرو۔ کلکٹر صاحب باہر آرہے ہیں۔"

میں نے کہا "کلکٹر ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ سڑک پر کیسی کلکٹری۔ آپ نے دیکھا کلکٹر صاحب کو اتنی بڑی سڑک ہے کہ اس پر سے سارے ہندوستان کے کلکٹر بیک وقت گذر سکتے ہیں۔ پھر کلکٹر تو آدمی ہی ہوتا ہے۔ کوئی ہاتھی تو نہیں ہوتا کہ اس کے لئے ساری سڑک کا تخلیہ کر دیا جائے۔"

ابھی میں اپنی نوجوانی کے جوش کا عملی مظاہرہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک موٹر کوٹھی کے اندر سے برآمد ہوئی۔ اس موٹر میں پچھلی سیٹ پر ایک کلکٹر بیٹھا تھا گویا ایک بت کی طرح۔ خد و خال کسی یونانی مجسمہ کی مانند۔ گورا رنگ لمبی اونچی ناک جو اس وقت مجھے ناک کم اور خطرناک زیادہ نظر آئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں اور بھرے بھرے گال۔ گلا نکٹائی میں یوں پھنسا تھا جیسے یہ نکٹائی خود انہوں نے نہ باندھی ہو بلکہ کسی دشمن نے باندھی ہو۔

جب کلکٹر کا یونانی مجسمہ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو میں نے کوٹھی کے پھاٹک پر نظر ڈالی۔ وہاں لکھا تھا "خواجہ عبدالغفور۔ آئی۔ اے۔ ایس"

یہ تھی خواجہ عبدالغفور صاحب سے میری پہلی ملاقات جسے نہ جانے کیوں میں آخری ملاقات بنانے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس دن کے بعد سے مجھے کشادہ دل، لمبی سڑکوں، یونانی مجسموں اور عبدالغفوروں سے چڑ سی ہو گئی۔

جب بھی میں عثمان آباد کی اس لمبی سڑک پر چہل قدمی کے لئے نکلتا تو یہ

خدشہ لگا رہتا کہ کہیں سڑک پر اچانک کوئی کلکٹر نہ نکل آئے، جیسا موت اور کلکٹر پوچھ کر تھوڑی آتے ہیں۔ پھر کئی برس بیت گئے وہ لمبی سڑکیں جو پہلے لمبی ہیں اور بھی لمبی ہوگئی البتہ کلکٹر کا خوف کچھ کم ہوگیا۔

چار پانچ برس پہلے ایک دن مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ بمبئی کے مشہور طنز نگار عبدالغفور صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور اس وقت سیمنٹ کے دفتر میں موجود ہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ وہی خواجہ عبدالغفور ہیں جن کی خاطر کئی برس پہلے مجھے سڑک کا تخلیہ کرنا پڑا تھا ۔۔۔ میں خالی الذہن حالت میں سیمنٹ کے دفتر پہ پہنچا تو دیکھا کہ وہی یونانی مجسمہ ایک کرسی پر رکھا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس مجسمہ کے بال اب ذرا سفید ہوگئے تھے اور اس مجسمہ کا پلستر بھی کہیں کہیں اتر گیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں اس مجسمہ کے ساتھ کوئی سنتری نہ ہو۔ جب دور دور تک سنتری نظر نہ آیا تو میری جان میں جان آئی۔ یونانی مجسمہ سے جب میرا تعارف کرایا گیا تو یونانی مجسمہ نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر مجھے بتایا گیا کہ غفور صاحب ان دنوں لطیفوں کی ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔

میں نے دل ہی دل میں کہا "بھئی! کمال ہے اب تو یونانی مجسمے بھی لطیفے کہنے لگے ہیں، یہ قیامت کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں؟"

تھوڑی سی رسمی بات چیت کے بعد غفور صاحب نے مجھے دوسرے دن اپنے پاس آنے کی دعوت دی اور چلے گئے۔ میں سارا دن سوچتا رہا کہ ایک۔۔۔

آئی۔اے۔ایس عہدیدار کا لطیفوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ملک کی دفتریت قدم قدم پر لطیفوں کو جنم دیتی ہے بہت سے ملازمین کو اُن کی وفات کے بعد ملازمت سے معطل کرتی ہے اور بہت سے ملازمین کو جیتے جی مار دیتی ہے۔ اتنے سارے دفتری مذاق کے باوجود میں نے آئی اے۔ایس عہدیداروں کو بے حد سنجیدہ پایا ہے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ فرشتے اور آئی اے ایس عہدیدار کبھی نہیں ہنستے۔ چنانچہ میں نے بہت کم آئی۔اے۔ایس عہدیداروں کو ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔ اس معاملے میں ایک صاحب کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ جس طرح گھوڑے کو بیٹھی ہوئی حالت میں دیکھنا نحوست کا باعث ہوتا ہے اسی طرح کسی آئی اے ایس عہدیدار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو دیکھنا بھی کچھ کم نحوست کا سبب نہیں ہو سکتا۔

میں مسلسل اس نکتہ پر غور کرتا رہا کہ خواجہ عبدالغفور صاحب آخر کس طرح لطیفے کہتے ہوں گے۔ اور ان پر کس طرح ہنستے ہوں گے۔ میں نے سوچا کہ وہ لوگوں کو اپنے لطیفوں سے کہیں زیادہ اپنی کمشنری کے حکم پر ہنساتے ہوں گے۔ حکم دیا کہ ہنسو اور لوگ ہنسنے لگے۔

مجھے وہ لطیفہ بھی یاد آیا کہ کوریا کی جنگ کے زمانہ میں ایک امریکی جنرل کوریا کی سپاہیوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔ اور ایک مترجم اس کی انگریزی تقریر کا کوریائی زبان میں ترجمہ کر رہا تھا۔ ایک مرحلہ پر امریکی جنرل نے اپنی تقریر میں ایک نہایت طویل لطیفہ سنایا۔ اور اس کے بعد مترجم نے اس طویل لطیفہ کے ترجمہ

کے سلسلہ میں صرف ایک جملہ کہا اور سارے کوریائی سپاہی پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ امریکی جنرل بہت حیران ہوا کہ اس کے اتنے طویل لطیفہ کا ترجمہ صرف ایک جملہ میں کس طرح ہو گیا۔ سو اس نے مترجم سے پوچھا۔ "بھئی! تم نے ایک جملہ میں اتنے بڑے لطیفہ کا ترجمہ کیسے کر دیا؟"

اس پر مترجم بولا "حضور! میں نے لطیفہ کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ میں نے سپاہیوں سے یہ کہا ہے کہ ابھی ابھی جنرل صاحب نے ایک لطیفہ سنایا ہے لہٰذا تم لوگ زور زور سے ہنسنے لگ جاؤ۔"

عہدیداری چیز ہی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو مارے خوف کے ہنسنا ہی پڑتا ہے۔ غرض میں کچھ ایسے ہی خیالات لے کر دوسرے دن غفور صاحب کے پاس پہنچا میں یہ سوچ کر گیا تھا کہ آج مجھے مصنوعی طور پر اتنا ہنسنا پڑے گا کہ شاید میں اصلی ہنسی کو اگلے کئی دنوں تک بھول جاؤں گا۔ مگر غفور صاحب نے جاتے ہی مجھے ایک ایسا لطیفہ سنایا جس نے ماحول کے سارے مصنوعی پن کو ختم کر دیا۔ انھوں نے کہا "ایک آئی۔ اے۔ ایس عہدیدار کو اپنے ماتحتین کو لطیفے سنانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر روز شام کے وقت اپنے ماتحتین کو طلب کرتے اور لطیفے سنانے لگتے۔ ماتحتین ان لطیفوں پر جی کھول کر ہنستے۔ ایک شام وہ حسب معمول اپنے ماتحتین کو لطیفے سنا رہے تھے، سب ہنس رہے تھے۔ مگر ایک ملازم بالکل خاموش تھا۔ اس نے ایک لطیفہ پر بھی ہنسنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ محفل برخواست ہوئی تو اس ملازم کے دوسرے ساتھیوں نے پوچھا۔ "بھئی! آخر تم نے صاحب کے ایک بھی لطیفے پر ہنسنے کی کوشش

نہیں کی۔ آخر بات کیا ہے؟" اس پر ملازم نے کہا "بھئی! اب مجھے ہنسنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو کل سے وظیفہ پہ علٰیحدہ ہو رہا ہوں۔ تم لوگ ابھی برسرِ خدمت ہو لہٰذا تم پہ ہنسنا فرض ہے ورنہ صاحب تمہارا EXPLANATION طلب کرلیں گے۔"

غفور صاحب نے یہ لطیفہ کچھ اس روانی سے سنایا کہ تکلّف کی ساری فضا نہس نہس ہو گئی۔ یوں لگا جیسے غفور صاحب کا "لکڑی والا یونانی مجسمہ" اچانک پیڈسٹل سے نیچے اتر آیا ہو اور ایک جیتے جاگتے گوشت پوست والے آدمی کے روپ میں مجھ سے ہمکلام ہو۔ کئی سال سے یہ مجسمہ میرے ذہن میں جامد و ساکت کھڑا تھا۔ جب اس مجسمہ کا تبسم پگھلنے لگا تو میں جی ہی جی میں خوش ہونے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے آبائی وطن کی سڑک پہ چلنے کے میرے مالکانہ حقوق بحال ہو گئے ہوں۔

غفور صاحب کا یہ روپ مجھے بہت پسند آیا اور اس کے بعد سے آج تک میں نے اُن کے اسی روپ سے اپنے تعلق کو برقرار رکھا ہے۔ اُس دن اُنھوں نے بے شمار لطیفے سنائے۔ ہر موضوع اور ہر مسئلہ پر وہ سچ مچ لطیفوں کے سوداگر ہیں آپ کو جتنے لطیفے چاہئیں ان سے لے لیجئے۔ عمدہ لطیفے، اعلیٰ قسم کے لطیفے۔ پائیدار لطیفے۔ کسی موضوع یا مسئلہ پہ اگر وہ لطیفے سنانا شروع کردیں تو مسئلہ تو ختم ہو جائے گا، لیکن غفور صاحب کے لطیفے ختم نہیں ہوں گے بلکہ بعد کو ان کے لطیفے خود ایک مسئلہ بن جائیں گے۔ بات میں سے بات یوں پیدا کریں گے جیسے ہم ہندوستانی بڑی صفائی سے بچے پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا

میں اُن سے حیدرآباد میں متعارف ہوا تھا۔ چندے زاں بعد انھوں نے مجھے بمبئی آنے کی دعوت دی۔ مرسنگار سمدر کے تعزیہ پروگرام میں شرکت کرنے کے لیئے۔

بمبئی میں غفور صاحب کو دیکھ کر ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جیسا ریلوں کے معاملے میں "ٹرنک و جنکشن" کو جو اہمیت حاصل ہے وہی اہمیت بمبئی کی تہذیبی زندگی میں غفور صاحب کو حاصل ہے۔ آپ کو کوئی بھی تہذیبی عارضہ لاحق ہو جائے تو آپ سیدھے غفور صاحب کے پاس چلے جایئے۔ بمبئی کا ہر تہذیبی مسئلہ غفور صاحب سے شروع ہوتا ہے اور اُنہی پر ختم ہوتا ہے۔ سردار جعفری نے غفور صاحب کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ "بمبئی کی تہذیبی زندگی غفور صاحب کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔" اس جملے میں، میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ "اگر بمبئی کی تہذیبی زندگی کے بغیر غفور صاحب کافی مکمل رہتے ہیں"۔ جس کسی شخص کے ذہن میں بمبئی کی تہذیبی زندگی کو خوشگوار بنانے کا سودا سماتا ہے وہ سیدھے غفور صاحب کے پاس چلا جاتا ہے۔

اگر آپ کو کسی ادیب کی سالگرہ منانی ہو تو غفور صاحب کے پاس چلے جایئے۔ کسی فنکار کی برسی منانا چاہتے ہوں تو غفور صاحب کو پکڑیئے۔ کسی کا تعزیتی جلسہ منعقد کرنا ہو تو غفور صاحب موجود ہیں۔ موسیقی کی محفل آراستہ کرنا ہو تو غفور صاحب سے رجوع کیجیے۔ حد تو یہ کہ قوالی کی محفلیں بھی غفور صاحب کی زد میں آجاتی ہیں۔ یہ کرنا ہو تو غفور صاحب، وہ کرنا ہو تو غفور صاحب۔ کہیں یہ ہو رہا ہو تو غفور صاحب، کہیں وہ ہو رہا ہے تو غفور صاحب۔ غرض بمبئی میں غفور صاحب کا حال اُس اعرابی کے اونٹ کا سا ہے جس سے کسی نے پوچھا کہ "میاں تم کیا کھاتے ہو؟" اعرابی نے کہا

"اونٹ" "کیا پیتے ہو؟" اعرابی نے جواب دیا" اونٹ"

"کیا پہنتے ہو؟" اونٹ"

"کہاں رہتے ہو؟" "اونٹ"

مخاطب اس "اونٹ اونٹ" کی تکرار سے چڑ کر بولا "میاں یہ کیا تم نے اونٹ اونٹ کی رٹ لگا رکھی ہے"۔

اعرابی بولا۔ صاحب! اونٹ کا گوشت کھاتا ہوں۔ اونٹ کا دودھ پیتا ہوں۔ اونٹ کی کھال پہنتا ہوں۔ اور اونٹ کی کھال کے خیمہ میں رہتا ہوں۔ بھلا اس میں چڑنے کی کیا بات ہے"۔

سچ تو یہ ہے کہ غفور صاحب بمبئی کی تہذیبی زندگی کے "اونٹ" ہیں۔ اور بمبئی کی تہذیبی زندگی ان کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو اعرابی اپنے اونٹ کے ساتھ کرتا ہے۔ لہٰذا کبھی کبھی تو بمبئی کی تہذیبی زندگی غفور صاحب کی کھال بھی پہن بیٹھتی ہے یہ اور بات ہے کہ ادھر کئی برسوں سے بمبئی کی تہذیبی زندگی کا یہ اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکا ہے۔ لوگ اسے بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔ اب یہ آثار پیدا ہو رہے ہیں کہ شاید یہ اونٹ لطیفوں اور مزاح نگاری کے کروٹ بیٹھ جائے۔

یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ غفور صاحب کو صرف لطیفوں سے ہی نہیں بلکہ سارے فنون لطیفہ سے دلچسپی ہے۔ موسیقی سے انھیں بے پناہ لگاؤ ہے۔ ایک بار میں نے ان کے مکان پر بمبئی کے ایک مشہور فلمی میوزک ڈایریکٹر کو ان سے موسیقی کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کرتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ کہیں غفور

"پلے بیک میوزک ڈائرکشن" بھی نہ دیتے ہوں اور ہمیں اب تک اس کی خبر نہ ہوئی ہو۔ آن کا گھر بمبئی کے فلم سٹاروں فنکاروں، مصوروں، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کا مرکز ہے۔

وہ ہر شخص سے اس کے پسندیدہ موضوع پر بات کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ صحافی سے بات کریں گے تو صحافی بن جائیں گے۔ مصور سے بات کریں گے تو مصور بن جائیں گے۔ صرف ایک ہی معاملہ میں، میں نے انھیں بے بس پایا ہے یعنے جب وہ اپنی بیوی سے بات کرتے ہیں تو خود بیوی نہیں بن سکتے۔ کیا کریں یہ تو قدرت کی مجبوری ہے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ یہ بھی بن جاتے۔ اتنی تیزی سے مختلف سانچوں میں ڈھلنے والی شخصیتیں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔

غفور صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس کام میں منہمک ہو جاتے ہیں اسے پورا کر کے رہتے ہیں، پھر کسی رکاوٹ یا مجبوری کا خیال نہیں کرتے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جس کا تعلق سردی سے آن کی "الرجی" سے ہے۔ الرجی بڑی عجیب و غریب اور لطیف شئے ہوتی ہے۔ ہر شخص کو کسی نہ کسی شئے سے الرجی ہو جاتی ہے۔ مثلاً امیر آدمی کو غریب سے الرجی ہوتی ہے۔ تاجر کو انکم ٹیکس کے عہدیداروں سے الرجی ہوتی ہے سوتنترا پارٹی کو سوشلزم سے الرجی ہو جاتی ہے۔ امریکہ کو ریڈ نام سے الرجی ہوتی ہے۔ ماؤزے تنگ کو روس سے اور اسرائیل کو عربوں سے الرجی ہو جاتی ہے۔

غفور صاحب چونکہ کوئی سیاسی شخصیت نہیں ہیں اسی لئے انھیں صرف سردی سے "الرجی" ہو جاتی ہے جیسے ہی کوئی سرد شئے غلطی سے آن کے بدن میں پہونچ جاتی ہے۔

سکنڈوں میں ان پر کھانسی کا شدید دورہ پڑتا ہے۔ پھر کھانسی بھی ایسی شدید کہ سانس لینا دوبھر ہوجائے، اور دیکھنے والا خوف زدہ ہوجائے۔ ایک دن وہ اپنے مکان پر بیٹھے حسب معمول نئے نئے لطیفے سنا رہے تھے کہ غلطی سے انھوں نے دوا کی ایسی گولی کھالی جس سے انھیں الرجی ہوجاتی ہے۔ انھوں نے آدھا لطیفہ ہی سنایا تھا کہ کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ لطیفہ جوں کا توں رہ گیا اور ہم سب لوگ پریشان ہوگئے۔ اب غفور صاحب نہ سانس لے سکتے ہیں نہ بات کرسکتے ہیں اور نہ ہی چین سے بیٹھ سکتے ہیں۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر میں بھی سانس لینا کم و بیش بھول گیا۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا اور جیسے ہی اس نے اینٹی الرجی انجکشن دیا وہ اچانک نارمل حالت پر آگئے۔ میں اس وقت تک اس ادھورے لطیفے کو بھول گیا تھا۔ بھلا ایسی حالت میں کس کی شامت پکاری ہے کہ وہ لطیفہ کے بارے میں سوچے لیکن جیسے ہی غفور صاحب کا نظام تنفس بحال ہوا اور وہ بات کرنے کے قابل ہوئے انہوں نے اپنی تکلیف یا الرجی کے بارے میں کوئی رسمی اظہار خیال کئے بغیر اچانک وہ ادھورا لطیفہ سنانا شروع کردیا کہ "ہاں بھئی! تو ہمارا لطیفہ کہاں تک پہنچا تھا۔ تو پھر آگے یوں ہوا کہ ـــ" اور پھر انہوں نے بڑے اطمینان سے نہ صرف لطیفہ کو مکمل کیا بلکہ لطیفہ سے متعلق ضروری ہنسی بھی ہنس دی۔

غفور صاحب کا حلقۂ احباب بے حد وسیع ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آخر وہ انواع و اقسام کے دوستوں سے کس طرح نباہ کرلیتے ہیں۔ تاجر، ادیب، فنکار، موسیقار، سرمایہ دار، سیاستداں، مزدور، فلمی اداکار غرض ہر قماش

کا آدمی ان کا دوست ہوگا اور آپ ان کی شخصیت کی پہلداری کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران رہ جائیں گے۔

اردو طنز و مزاح سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے۔ انہوں نے ہر سطح پر اس صنفِ ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

"قہقہہ زار" کے بعد "شگوفہ زار"، "لالہ زار" اور "گل و گلزار" کی اشاعت کے ذریعے انہوں نے اردو طنز و مزاح کو بہت کچھ دیا ہے۔ کنہیا لال کپور نے ایک بار ایک محفل میں "شگوفہ زار" کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ کتاب اردو طنز و مزاح کی ایک ڈائرکٹری ہے اور اسے ہر مزاح نگار کو پڑھنا چاہیے۔"

غفور صاحب ادبی محفلوں میں لطیفے بھی سناتے ہیں۔ لطیفہ سنانے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا ہے۔ وہ لطیفہ کو ذہن کے اوپر اچانک مسلط نہیں کرتے بلکہ دھیمے دھیمے لطیفے کی لطافت کو سننے والے کے اندر اتار دیتے ہیں۔ یہی انداز ان کے مزاحیہ مضامین کا بھی ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین پڑھئے تو احساس ہوگا کہ آپ بیک وقت شرافت اور ظرافت دونوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

غفور صاحب جیسی شخصیتیں ہماری ادبی و تہذیبی زندگی کا اثاثہ ہوتی ہیں اور ایسی شخصیتوں کو دیکھ کر ہی ہمیں یک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں شریف اور نیک نفس انسانوں کی پیدائش ممنوع قرار نہیں دی گئی ہے۔ شریف آدمی اگر پیدا ہونا چاہیں تو وہ پیدا ہو سکتے ہیں اور اپنے کئے کی سزا پا سکتے ہیں۔

(۱۹۷۰ء)

حسن الدین احمد

نومبر ۱۹۷۲ء میں جب میں ملازمت کے سلسلے میں دہلی آیا تو ایکدن ایک دوست نے آکر اطلاع دی کہ حسن الدین احمد صاحب حکومت ہند کے اسپیشل آفیسر (وقف) بن کر حیدرآباد سے دہلی آگئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ حیدرآباد کے اپنے بیس سالہ قیام کے دوران میں کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی اب آخر انہیں اس دیار غیر میں مجھ سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ بہت غور کیا تو ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی کہ ایک حیدرآبادی جب دہلی یا شمال کے کسی شہر میں پہنچتا ہے تو اندر ہی اندر بڑا بے چین سا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ پوری بے تکلفی کے ساتھ لوگوں کے سامنے نہ تو "جی ہو" "جی ہو" کہہ سکتا ہے اور نہ ہی "میں آتوں، میں جاتوں اور میں بولتوں" کہہ سکتا ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے حیدرآبادیوں کی رگوں پر بڑا تناؤ سا چھایا رہتا ہے۔ طبیعت

بڑی مضمحل اور بوجھل سی رہتی ہے۔ دنیا بڑی فضول سی شئے نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے دہلی پہنچے ہوئے آٹھ دن ہوئے تھے اور میری ذات میں بہت سے "جی ہو" جمع ہو گئے تھے اور شاید حسن الدین احمد صاحب کی ذات میں تو مجھ سے بھی زیادہ "جی ہو" جمع ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ مجھ سے دو دن پہلے دہلی آئے تھے۔ تبھی تو انہوں نے مجھ سے ملنے میں پہل کی تھی۔" میں نے اپنے دوست سے کہا کہ جب وہ مجھ سے ملنا ہی چاہتے ہیں تو ان سے مل لیتے ہیں، مگر یار دہلی بڑے فاصلوں کا شہر ہے۔ یہاں آدمی کا ایک دوسرے سے ملنا تو درکنار حیدر آبادیوں کا تک ایک دوسرے سے ملنا دشوار ہے۔"

وہ بولا "تم نہ گھبراؤ! وہ تم سے بہت قریب ہیں، تم ابھی یہاں سے فون ملاؤ۔ وہ تم سے بات کریں گے۔ اس کے بعد تم فون کا ریسیور نیچے رکھ دو اور ذرا اونچی آواز میں بات کا سلسلہ جاری رکھو، تم یقین کرو کہ اس کے بعد ٹیلیفون کی مدد کے بغیر ان کی بات سن سکو گے۔" بعد میں یہ بات درست ثابت ہوئی۔ کیونکہ ہم دونوں کے دفتر ایک ہی بلڈنگ میں واقع تھے۔

میں ان سے ملنے گیا تو بڑی گرمجوشی اور تپاک سے ملے۔ یوں لگا جیسے ان کے چہرے پر جگہ جگہ "خوش آمدید" کے بینر لگ گئے ہیں۔ اپنی کرسی سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑا طاقتور مصافحہ کیا اور پھر اسی گرمجوشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں دل ہی دل میں ان کے اس گرمجوشانہ ردعمل سے خوش ہوتا رہا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو ہر کس و ناکس کا خیر مقدم اسی طرح کرتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد وزارت قانون کا ایک چپراسی ان کے کمرہ میں داخل ہوا اور وہ اس کے لئے

بھی "خوش آمدید" کا بینر بن گئے۔

حیدرآباد میں انہیں چیدہ چیدہ طور پر دیکھا تھا۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ انہیں تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جو میں نے تفصیل سے انہیں دیکھنے کی کوشش کی تو ان کی آنکھوں کے اوپر پھیلی ہوئی تفصیلی بھنوؤں پر ہی نظر جم کر رہ گئی۔ ایسی تفصیلی بھنویں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ ایسی گھنی اور گنجان بھنویں کہ لگتا ہے بھنویں نہیں مونچھیں ہیں۔ پھر لطف کی بات یہ کہ حسن الدین احمد صاحب مونچھوں کے معاملے میں تفصیل کے قائل نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے مختصر سی مونچھیں رکھی ہیں جو بھنووں کی مونچھوں سے بس ذرا سی بڑی ہوں گی۔ بہت گورا چٹا رنگ۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ ناک ایسی ستواں کہ عینک کا فریم بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس پر جم جاتا ہے۔ ایسی ناکیں عینک کا فریم رکھنے کے لئے بہت موزوں ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بینائی کی کمزوری کی بناء پر عینک لگائے ہوں مگر قدرت نے انہیں ایک ایسی ناک بھی فراہم کی ہے جس پر عینک کا فریم بڑا بھلا لگتا ہے۔

اُن سے میری یہ پہلی ملاقات تھی اس لئے بڑی دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں مگر جب میں جانے لگا تو وہ اچانک غیر رسمی بن گئے اور کہنے لگے "کل سے دوپہر کا کھانا آپ میرے ہی ساتھ کھایا کریں گے۔"

میں نے کہا "میں دوپہر کے کھانے میں یقین نہیں رکھتا اسلئے دوپہر کا کھانا عموماً رات کو کھاتا ہوں"۔ بولے "کھانے میں تو میں بھی یقین نہیں رکھتا۔ البتہ اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ اسی بہانے دو حیدرآبادیوں کی روزانہ ملاقات ہو جاتی ہے۔"

اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ دوپہر کو ہمیشہ دیر سے اُن کے پاس پہنچتا اور ان کا چپراسی میز پر کھانا سجا دینے کے بعد میرا انتظار کرنے لگتا۔ اور حسن الدین احمد صاحب اپنے کام میں مصروف رہتے۔ سردی کے دن تھے اس لئے ہر روز یہ معمول بھی بن گیا تھا کہ کھانا دوبارہ گرم ہوتا تھا۔ ایک میرے آنے سے پہلے دوسرے میرے آنے کے بعد۔

ان دنوں حسن الدین احمد صاحب اکیلے ہی دہلی آئے تھے اور اوکھلا میں اپنے کسی دوست کے یہاں عارضی طور پر مقیم تھے، اسی لئے دوپہر کا کھانا وہ دفتر کی کینٹین سے منگوایا کرتے تھے یہ کھانا جس قسم کا ہوتا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کھانا شروع ہوتے ہی ہم ایک دوسرے کی پلیٹوں میں زیادہ سے زیادہ دوسے اور وڑے ڈالنے کی کوشش کرتے تھے اور اس عمل کو حیدرآبادی تہذیب و شائستگی پر محمول کر کے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ حسن الدین احمد صاحب کے گھرانے کے کھانے حیدرآباد بلکہ دکن میں بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں، مگر یہاں انہیں مدراسی دوسے اور وڑے کھاتے دیکھ کر نہ صرف ان پر ترس آتا تھا بلکہ کبھی کبھار اپنے آپ پر بھی ترس آتا تھا۔ وہ کھانا کھاتے تو یوں لگتا جیسے "فرائضِ منصبی" سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ اس کھانے سے اپنے آپ کو حتی الامکان دور رکھنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ہم حیدرآبادی تہذیب کی آڑ لیکر ایک دوسرے کی پلیٹوں میں کھانے کی اشیاء ڈالتے جائیں۔ آخر زمانہ میں یہ مسابقت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ایک دن میں نے سارے دوسے اور سارے وڑے انکی پلیٹ میں ڈالدیئے۔

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر پوچھا "آپ کچھ نہیں کھائینگے؟"
میں نے کہا "بھوک نہیں ہے۔ کل ہی دوپہر میں تو آپ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔"

بات دراصل یہ ہے کہ کل کینٹین سے کچھ ایسے ذرے آئے تھے کہ لگتا ہے کہ یہ اگلے آٹھ دس دنوں تک ہضم نہیں ہوں گے. آج سے آپ کھاتے جائیے میں صرف آپکو دیکھتا رہوں گا۔"

وہ میری بات کو تاڑ گئے زور سے ہنس کر بولے "سچ تو یہ ہے کہ آپ کو دوپہر میں اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دے کر میں خود پریشان ہو گیا ہوں. کئی دنوں سے عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں. نہ یہ کھانا مجھ سے کھایا جاتا ہے اور نہ ہی آپ سے. مگر شرافت بھی تو آخر ایک چیز ہے. یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ میں آپکو کھانے کیلئے منع کرتا. مسلمان جب ایک بات کہہ دیتا ہے تو اس پر عمل بھی کرتا ہے، چاہے اس کے لئے اُسے کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔"

میں نے کہا "یہ اچھا ہوا کہ آج کھانے کے مسئلہ پر آپ سے کھل کر بات ہو گئی. میں جانتا ہوں کہ ہر روز دوپہر کے کھانے کی قیمت آپ ہی ادا کرتے ہیں لیکن میں آپکو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ میں بھی اس کھانے کی قیمت ادا کرتا ہوں. یہ اور بات ہے کہ یہ قیمت ڈاکٹر کو ادا کر رہا ہوں۔"

ہنس کر بولے "آپ تو پھر بھی نفع میں ہیں کیونکہ میں تو اس کھانے کی قیمت دو دفعہ ادا کرتا ہوں. پہلی بار کینٹین کو اور دوسری بار ڈاکٹر کو۔" یہ کہکر انہوں نے دوسوں سے بھری ہوئی پلیٹ میز پر رکھدی اور بولے "یہ اچھا ہوا کہ آج آپ نے پوری بے تکلفی کے ساتھ کھانے کے مسئلہ پر بحث کر لی ورنہ میں حیدرآبادی شرافت کے تحت چپ چاپ ہی کھانا کھاتا رہتا اور ایک سچے مسلمان کی طرح ڈاکٹر کو

بل ادا کرتا رہتا "

اس کے بعد ہر روز دوپہر میں ایکساتھ چائے پیتے اور چائے پیتے پیتے دنیا بھر کی باتیں کر لیتے۔ اُن دنوں اُنکی مشہور معروف کتاب "اُردو الفاظ شماری" طباعت کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب انہوں نے "الفاظ شماری" کی بات نہ کی ہو۔ "الفاظ شماری" جیسے دقت طلب اور خشک کام میں بھلا میں کس شمار میں آتا تھا، لیکن وہ ہر تھوڑی دیر بعد موضوع کو الفاظ شماری کی طرف موڑ کر لے آتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، یہ کوئی بتلا نہیں سکتا۔ لیکن اُن دنوں حسن الدین صاحب کی بات چیت کا اونٹ ہمیشہ ہی الفاظ شماری کی کروٹ میں بیٹھتا تھا۔ یہ بات انکی فطرت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب وہ ایک کام میں لگ جاتے ہیں تو سدا اسی کی دھن میں لگے رہتے ہیں اور جب تک اسے پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچا لیتے، تب تک اُنہیں قرار نہیں آتا۔ اپنے کام میں اس بری طرح غرق ہونے والے انسان میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ میں اُن سے اُس وقت ملا تھا جب ان پر الفاظ شماری کا بخار چڑھا ہوا تھا، بعد میں یہ بخار قابو میں آیا تو وہ "امیر خسرو" میں مبتلا ہو گئے۔ "امیر خسرو" میں مبتلا ہونے کی اطلاع مجھے ایک دن اس طرح ملی کہ ایک دن پہلے میں اُن سے ملا تھا تو وہ بدستور "الفاظ شماری" کی بات کئے جا رہے تھے۔ دوسرے دن میں اُن کے ہاں گیا اور باتوں باتوں میں کسی مغربی ادیب کی رائے کا حوالہ میں نے دیا تو فوراً میری بات کو کاٹ کر بولے "یہی بات امیر خسرو نے بھی کہی ہے"

میں نے کہا "کہی ہوگی اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔ کہنے لگے "جی ہوا اگر امیر خسرو کی کہی ہوئی بات مستند ہے۔ امیر خسرو کی تو بات ہی نرالی ہے۔ ان سے بڑا عالم، ان سے بڑا شاعر، ان سے بڑا صوفی کوئی ہو تو مجھے بتلایئے۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ دنیا داری کے معاملہ میں بھی امیر خسرو اتنے ہی کامیاب تھے۔ ایسے متوازن آدمی جن کی ذات میں دنیا اور عقبیٰ دونوں ہم آہنگ ہوں، بہت کم پیدا ہوتے ہیں"۔ یہ کہہ کر انہوں نے امیر خسرو کے دوہے سنانے شروع کر دیئے۔ پھر ان کی شاعری کی نزاکتوں اور پہلوداری سے مجھے واقف کرانے لگے۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ امیر خسرو کے بارے ہی میں بات کرتے رہے۔ بعد میں جب میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ ان کے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے اس سے پوچھا "بھئی آج یہ حسن الدین احمد صاحب کو کیا ہو گیا ۔۔۔۔؟ کل تک اچھے بھلے "الفاظ شماری" پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ آج یہ امیر خسرو کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟"

میرے دوست نے کہا "یار تم بھی بڑے غافل آدمی ہو۔ کیا تمہیں پتہ نہیں کہ وہ امیر خسرو کی سات سو سالہ قومی تقاریب کی مرکزی کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنا دیئے گئے ہیں، اب یہ تو ہونا ہی تھا"۔

میں نے ان سے اپنی ملاقات کو دو ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک "دورِ خسرویات" اور دوسرا "دورِ الفاظ شماری"۔ موخرالذکر دور میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ الفاظ شماری کے مختلف اسرار و رموز سے مجھے واقف کرواتے تھے۔ مجھ پر یہ کیا موقوف ہے، وہ ہر ایک کو الفاظ شماری کے دام میں گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی الفاظ شماری کے فوائد بیان کرنے لگ جاتے (حالانکہ ہم لوگ الفاظ شماری

کے نقصانات سے بھی واقف تھے) کہنے کہ جب تک کسی زبان کی سائنسی ڈھنگ سے الفاظ شماری نہ کی جائے وہ پروان نہیں چڑھ سکتی۔ الفاظ شماری کے سارے سسٹم سے ایک دن مجھے تفصیلی طور پر واقف کروایا، تو میں نے کہا حسن الدین صاحب ایک اعتبار سے "الفاظ شماری" اصل میں لفظوں کی مردم شماری ہے۔ یعنی ایک ایک لفظ کو بس گنتے چلے جائیے۔"

میری بات سن کر انہوں نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ کس احمق سے پالا پڑا ہے کہ اتنے اہم کام کو مردم شماری سے ملا رہا ہے۔"

میں اور میرے دوست قمر احسن کے دماغوں پر "الفاظ شماری" کچھ اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ لگتا تھا ہم بھی ایک دن صرف لفظ ہی لفظ بن کر رہ جائیں گے۔ ان ہی دنوں میرے مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ "قصہ مختصر" چھپ کر آیا تو میں نے اس کا نسخہ حسن الدین صاحب کو دیا۔ سوچا تھا کہ دوسرے دن وہ ملیں گے تو میری مزاح نگاری کے بارے میں ضرور اظہار خیال کریں گے۔ مگر دوسرے دن ملے تو چھوٹتے ہی کہنے لگے "میں نے آپکی کتاب کل رات پڑھی۔ یہ کیا بات ہے کہ آپ اپنی تحریر میں "تو" اور "البتہ" کا زیادہ استعمال کرتے ہیں!" یہ جملہ سن کر تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ البتہ میں نے سنبھل کر کہا "یہ بتائیے کہ آپ میری کتاب پڑھتے رہے یا صرف الفاظ شماری کرتے رہے؟"

کہنے لگے "دونوں کام کرتا رہا!"

میں نے کہا "البتہ میں اسلئے استعمال کرتا ہوں کہ البتہ کا لفظ مجھے بہت پسند

البتہ میں "البتہ" کو اتنا زیادہ بھی استعمال نہیں کرتا، البتہ جہاں "البتہ" کی ضرورت ہوتی ہے وہیں "البتہ" کو مضمون میں شامل رکھتا ہوں۔ البتہ میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ باوجود ان "البتوں" کے آپ کو میرے مضامین کیسے لگے؟"

کہنے لگے "آپ کے مضامین بے حد پسند آئے۔ البتہ اُن میں کم "البتے" ہوں تو اچھا ہے۔"

اسی دور میں الفاظ شماری کا ذکر ہے کہ ایک دن میں اور قمر احسن بڑی دیر تک حسن الدین احمد صاحب سے الفاظ شماری کے بارے میں باتیں کر کے باہر نکلے۔ ذہن پر بوجھ تو تھا ہی کسی بات پر قمر احسن اور مجھ میں اختلاف پیدا ہو گیا، بات آگے بڑھی اور قمر نے کوئی سخت بات مجھے کہی تو میں نے چھوٹتے ہی کہا "قمر اب چپ رہو ورنہ میں تمہاری نشان میں الفاظ شماری شروع کر دوں گا" یہ سنتے ہی قمر پیٹ پکڑ پکڑ ہنسنے لگا۔ کہنے لگا "تم نے "الفاظ شماری" کو جو نئے معنی پہنائے ہیں وہ بہت خوب ہیں کہو تو ان معنی کی اطلاع حسن الدین احمد صاحب کو بھی دیدیں؟"

میں نے کہا "ایسا قطعاً نہ کرنا ورنہ وہ میری "الفاظ شماری" شروع کر دیں گے۔"

پھر وہ دن بھی آیا جب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں "الفاظ شماری" کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ رسم اجرا میں وہ عجز و انکسار کا نمونہ بنے ایک کونے میں یوں کھڑے رہے جیسے کہنا چاہتے ہوں "دیوان غالب کس نے لکھا ہے، یہ میں بالکل نہیں جانتا" جلسے میں ان کے کام کی تعریفیں ہوتی رہیں اور شرم کے مارے ان کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں

جلسہ کے بعد انہوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ میرے دونوں ہاتھوں میں تھمایا

تو اسکے بھاری بھرکم بوجھ کو سنبھالتے ہوئے مجھے وہ مصرعہ یاد آگیا ؎

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت کہاں مجھے

کتاب کیا تھی اچھا خاصا چبوترہ تھی۔ ایسی ضخیم کتابیں اردو میں بہت کم چھپی ہونگی

میں تھوڑی دیر تک اس کتاب کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر اپنی قوت کا اندازہ لگاتا رہا لیکن

پھر اس ڈر سے یہ کتاب انہیں واپس کردی کہ اگر خدانخواستہ یہ کتاب میرے ہاتھوں

سے چھوٹ کر پاؤں پر گر پڑی تو کئی دن لنگڑاتے پھرنا ہوگا۔ میں نے حسن الدین احمد صاحب

کے گھر میں وہ منظر بھی دیکھا جب اس کتاب کے غالباً ڈھائی سو نسخے حیدرآباد سے

آگئے تھے اور ان کا "دیوان خانہ" الفاظ "نماری" سے لبالب بھر گیا تھا۔ حسن الدین احمد

صاحب کہنے کو تو آئی۔ اے۔ ایس عہدہ دار ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ حیدرآباد

کے ایک ایسے ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے افراد کے ناموں کے ساتھ

"یار جنگ" کا لقب وابستہ رہا ہے۔ لیکن ان دونوں مجبوریوں کے باوجود وہ عملی

زندگی میں اپنے آپ کو ایک "عام آدمی" کی طرح پیش کرتے ہیں۔ ان کے عام آدمی

ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ ایک بار اس خاکسار کی "آٹو سائیکل" کی

پچھلی نشست پر بیٹھ چکے ہیں۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ آئی۔ اے۔ ایس عہدے داروں

کے "قواعد ملازمت" میں اول تو "آٹو سائیکل" پر بیٹھنا ہی منع ہے اور آپ تو اس کی

پچھلی نشست پر بیٹھنے چلے ہیں"۔ لیکن وہ نہ مانے کہنے لگے" اس سے کیا فرق پڑتا

ہے ۰۰۰ پہلے اور غالباً آخری آئی۔ اے۔ ایس عہدیدار ہیں جنھیں میری آٹو سائیکل پر

بیٹھنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ مگر اس کا ایک فائدہ میرے حق میں یہ ہوا کہ اب جو کوئی
بھی میری آٹو سائیکل کا مذاق اڑاتا ہے یا اس پر بیٹھنے سے انکار کر دیتا ہے تو میں اسے
حسن الدین احمد صاحب کا حوالہ دیکر چپ کرا دیتا ہوں۔ گھر اور دفتر میں بھی میں نے انہیں
ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

وہ دفتر کا کام بڑی محنت اور لگن سے کرنے کے عادی ہیں بلکہ یوں محسوس
ہوتا ہے کہ وہ دفتر کا نہیں گھر کا کام کر رہے ہوں۔

وقت کی پابندی تو ہر آئی۔ اے۔ ایس عہدیدار کرتا ہی ہے، لیکن یہ وقت کی
پابندی کے معاملہ میں دیگر آئی اے ایس عہدیداروں سے کم از کم آدھ گھنٹہ آگے رہتے
ہیں۔ کہیں چھ بجے جانا ہو تو یہ ساڑھے پانچ بجے ہی پہنچ جائیں گے۔

اردو زبان اور ادب ان کی دو بڑی کمزوریاں ہیں۔ اردو کی خدمت وہ کچھ
اس انداز سے کرتے ہیں جیسے اگر وہ اردو کی خدمت نہ کریں تو حشر کے دن اردو
والے ان کے دامن گیر ہو جائیں گے۔ اسی خدمت کے جذبہ کے تحت انہوں نے
حیدرآباد میں ایک "ولا اکیڈیمی" بنا رکھی ہے۔ جس کی جانب سے اردو کی کئی کتابیں
شائع ہو چکی ہیں۔ میں اکثر مذاق میں ان سے کہتا ہوں کہ "ولا اکیڈیمی" کا سب سے بڑا فائدہ
یہ ہے کہ اردو کی بہت سی ناقابل اشاعت کتابوں کی صورت نکل آئی ہے۔ ورنہ یہ
کتابیں کیسے چھپتیں"۔

ان کی ایک اور خوبی یا خرابی یہ ہے کہ کبھی خود موٹر نہیں چلاتے، بلکہ یہ ذمہ
داری انہوں نے مسز حسن الدین احمد کے سپرد کر رکھی ہے۔ ایسا انہوں نے غالباً

اسلئے کیا ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر موٹر چلاتا ہے تو اس وقت وہ اپنی مرضی کے مطابق موٹر نہیں چلا سکتا بلکہ اُسے ہمیشہ اپنی بیوی کی اِن ہدایات پر عمل کرنا پڑتا ہے کہ رفتار کم کرو، بریک لگاؤ، ایکسلیٹر کو دباؤ، ہارن بجاؤ، وغیرہ وغیرہ۔

وہ ایک سچے اور مخلص آدمی ہیں اسلئے ہر کس وناکس کی بات پر یقین کرلیتے ہیں۔ اور بعد میں حسبِ استطاعت نقصان اُٹھاتے ہیں۔ بعض اوقات مجھے اُن کا خلوص معصومیت کی حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کی معصومیت کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ میرے اور ان کے ایک مشترکہ دوست نے ایک بار اُن سے کہا کہ "صاحب! آپ اگلے اتوار کو کھانا ہمارے ساتھ کھائیے"۔ اور پھر اُن سے یہ بھی کہا کہ وہ مجھے بھی ساتھ لیتے آئیں۔ حسن الدین احمد صاحب نے اس بات پر یقین کرلیا اور اگلے اتوار کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے جب اطلاع دی کہ مجھے بھی کھانے پر اُن کے ساتھ چلنا ہے تو میں نے دبی زبان میں کہا "جناب والا! میں اپنے دوست کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو رسمی طور پر ہر کسی کو ایسی دعوت دیتے ہیں۔ بڑے من موجی آدمی ہیں۔ آج کہی ہوئی بات انہیں کل یاد نہیں رہتی۔ پھر بھی آپ چلنے سے پہلے مزید ایکبار توثیق کر لیجئے کہ آیا واقعی اُنہوں نے ہمیں کھانے پر بلایا ہے۔ پھر ذرا سوچیئے کہ ہم اگر بیس میل کا فاصلہ طے کرکے اُن کے گھر پہونچیں اور بعد میں پتہ چلے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں تو اچھا نہیں معلوم ہوگا"!

بولے "مگر یہ بھی تو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک شخص نے کھانے کی دعوت دیدی اور آپ اُس سے دوبارہ پوچھنے جارہے ہیں کہ واقعی آپ نے دعوت دی ہے یا نہیں؟"

میں نے کہا "ایسا ہے تو مجھے آپکے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہیں، مجھے ان کھانا نہ ملے، آپکی موٹر میں ذرا سی "آؤٹنگ" تو ہو جائیگی"۔

اگلا اتوار جب آیا تو میں وقت مقررہ پلان کے ہاں پہنچ گیا۔ پھر میں حسن الدین احمد صاحب اور مسز حسن الدین احمد دعوت کی سمت روانہ ہو گئے۔ حسب معمول مسز حسن الدین احمد موٹر چلا رہی تھیں۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور کہرے میں راستہ بھی صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اور ہمیں شہر سے باہر جانا تھا۔ بڑی مشکل سے قدم قدم پر راستہ پوچھ کر ہم "دعوت" کی جانب بڑھ رہے تھے۔ موٹر میں بڑی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے مسز حسن الدین احمد سے پوچھا "بھابی! یہ بتائیے بیس میل دور جا کر واپس آنے میں کتنے روپیہ کا پٹرول خرچ ہو گا۔؟"

وہ بولیں "چالیس پچاس روپیہ کا پٹرول تو لگ ہی جائے گا"۔

اس پر میں نے کہا "چالیس پچاس روپیہ میں تو ہم نئی دہلی کے کسی بھی اچھے ہوٹل میں کھانا کھا سکتے ہیں"۔

میری اس بات پر حسن الدین احمد صاحب کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ بولے "آپ تو ہمیشہ غیر سنجیدہ رہتے ہیں۔ ایک شخص نے اتنے خلوص سے کھانے پر بلایا ہے ———— اور آپ کھانے کی قیمت کا تعین کرنے چلے ہیں۔ قیمت تو کھانے کی نہیں خلوص کی ہوتی ہے"۔

میں نے کہا "یہ بات ہے تو چلتے رہئے ورنہ میں تو آپ کو راہ راست پر لانے کی آخری کوشش کر رہا تھا"۔

سفر کی بڑی صعوبتیں اٹھا کر ہم منزلِ مقصود پہ پہونچے۔

"منزلِ مقصود" پر نظر ڈالی تو "منزلِ مقصود" کے چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا نظر آیا۔

میں نے کہا: "میں سمجھتا ہوں میزبان صاحب کھانا کھا کر سو گئے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے گھر میں کہیں بھی کوئی بتی نہیں جل رہی ہے"۔

اس پر حسن الدین احمد صاحب نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں! ہمیں پہنچنے میں پندرہ منٹ کی دیر تو ہو گئی ہے ۔۔ ہو سکتا ہے کہ اُن لوگوں نے انتظار کر کے کھانا کھا لیا ہو"۔

میں دل ہی دل میں اُن کی معصومیت پر مسکراتا رہا۔ اندھیرے میں جب ہم نے دستک دی تو اندھیرے نے اس دستک کو نگل لیا۔ کئی بار اُنہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ بالآخر بڑی دیر بعد مکان کے ایک گوشہ میں بتی جلی۔ بتی جلتے ہی حسن الدین احمد صاحب کے چہرے پر اُمید کی ہزاروں شمعیں روشن ہو گئیں۔ میری طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے "اب تو یقین آیا نا آپ کو کہ آج یہاں ہماری دعوت ہے۔ آپ تو یونہی لوگوں کو بدنام کرتے رہتے ہیں"۔ پھر گھر میں ایک ایک کر کے بتیاں روشن ہوتی چلی گئیں اور بعد میں ایک بڑھیا جو غالباً ہمارے دوست کی خادمہ تھی گھر سے باہر نکل آئی۔

میں نے پوچھا "آپ کے صاحب گھر پر ہیں"؟

وہ بولی "صاحب! وہ تو دو دن سے دہلی سے باہر ہیں"۔

میں نے حسن الدین احمد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بڑھیا سے پوچھا
"میم صاحبہ ہیں؟"

وہ بولی "وہ بھی صاحب کے ساتھ گئی ہیں۔"

یہ سنتے ہی میں نے حسن الدین احمد صاحب پر ایسی نظر ڈالی جیسے ہندوستانی فلموں کے ویلن ہیرو پر ڈالتے ہیں۔ پھر میں چپ چاپ چلتا ہوا موٹر کے پاس آگیا۔ حسن الدین احمد صاحب بدستور ہمارے دوست کی خادمہ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ آس بھی کیا بری چیز ہوتی ہے۔ پھر آہستگی سے بولے "اصل میں آپ کے صاحب نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ کیا وہ تمہیں اس بارے میں کچھ کہہ گئے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ہمارا کھانا تیار کروا دیا ہو۔"

یہ سنتے ہی بڑھیا گھر کے اندر چلی گئی اور دروازہ کے ایک پٹ کو بھیڑ کر اور دوسرے کو آدھا کھینچ کر دروازہ میں یوں کھڑی ہو گئی جیسے گولکنڈہ کے قلعہ پر اورنگ زیب کے حملہ کے وقت عبدالرزاق لاری قلعہ کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے کہا "صاحب! معاف کرنا، یہاں کوئی کھانا وانا تیار نہیں ہوا ہے۔ میں خود دوپہر سے بھوکی ہوں۔ صاحب کل آئینگے تو اُن سے بات کیجیے۔" یہ کہہ کر اُس نے زور سے دروازہ یوں بند کیا جیسے اُسے یہ اندیشہ ہو کہ اگر ذرا بھی موقعہ ملے تو ہم لوگ گھر کے اندر گھس جائیں گے اور بچا کھچا سارا کھانا کھا لیں گے۔

حسن الدین احمد صاحب نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے موٹر کی طرف آئے۔ نہ تو میں نے کچھ کہا اور نہ ہی اُنہوں نے مسز حسن الدین احمد بھی چپ چاپ موٹر چلاتی

رہیں۔ آدھا راستہ اسی خاموشی میں طے ہوا۔۔۔ اس کے بعد حسن الدین احمد صاحب نے بڑی خفت کے ساتھ مجھ سے پوچھا: "اس وقت کونسی ہوٹل کھلی ہوگی؟" میں نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا: "اب آپ کوئی تکلف نہ کریں۔ میرا کھانا تو گھر پہ تیار رہے اور پھر آپ کے پاس تو ربیع بحر بہ ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے!"

وہ بڑی دیر تک مجھے کہیں لے جا کر کھانا کھلانے پر مصر رہے۔ میں نے کہا "میں کھانا کھانے کے ارادے سے نہیں نکلا تھا۔ میرا مقصد تو صرف "آؤٹنگ" تھا۔ وہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔ میری گزارش اب صرف اتنی ہے کہ کل آپ ہمارے دوست کو فون کریں اور اپنے طور پر معذرت کرتے ہوئے اتنا کہیں کہ ہم کسی مصروفیت کی وجہ سے آپ کے ہاں کھانے پر نہیں آسکے۔" انہوں نے وعدہ کیا اور چلے گئے۔

دو دن بعد حسن الدین احمد صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے: "میں نے آپ کے کہنے کے مطابق آپ کے دوست کو فون کیا تھا۔ جیسے ہی میں نے کہا کہ ہم نہیں آسکے تو وہ دوسری طرف برہم ہو گئے۔ کہنے لگے صاحب ہم نے کھانا پکا کر رات ایک بجے تک آپکا انتظار کیا، مگر آپ نہیں آئے۔ یہ بہت بری بات ہے۔ اب جرمانہ کے طور پر آپکو اپنے ہاں دعوت کرنی ہوگی!"

سنا ہے کہ حسن الدین احمد صاحب نے آٹھ دن بعد سچ مچ ہمارے دوست کی دعوت کی اور مجھے اس میں نہیں بلایا۔ محض اس ڈر سے کہ کہیں میں راز فاش نہ کر دوں۔

حسن الدین احمد صاحب نے بڑی الفاظ شماری کی ہے۔ ہزاروں لفظوں کو

وہ شمار کر چکے ہیں، مگر جب میں اُن کی شخصیت کی الفاظ شماری کرنا چاہتا ہوں تو شرافت، مروت، خلوص، عجز و انکساری اور انسان دوستی کے سوائے مجھے کوئی اور الفاظ نہیں ملتے۔ ایک موہنی سی شخصیت اور بس اتنے ہی الفاظ پر مشتمل!"

مگر میں سوچتا ہوں کہ ایک انسان کی شخصیت پانچ لفظوں میں سمٹ جائے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ ہمارے اطراف ایسے کتنے افراد رہتے ہیں۔ جن کے حصہ میں ایک لفظ بھی نہیں آتا اور وہ زندگی بھر ایک ایک لفظ کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ یہیں آ کر میں "الفاظ شماری" کی اہمیت کا قائل ہو جاتا ہوں۔

(۱۹۷۳ء)

نریندر لوتھر
شیشے کا آدمی

سنہ ۱۹۶۱ء کے اواخر کی بات ہے کہ حکومت آندھرا پردیش کے محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ریاست کے اردو اخبارات کو ایک سرکاری فریضہ کے طور پر پڑھے اور ان میں شائع ہونے والے مواد کی جانب حکومت کی توجہ مبذول کرائے۔ میں تنخواہ لے کر اردو اخبار پڑھنے کو بہت زیادہ بری بات نہیں سمجھتا بلکہ اگر معقول تنخواہ ملے تو میں چینی اخبار پڑھنے کو بھی بری بات نہیں سمجھتا اسی لئے میں نے اس آسامی کے لئے درخواست دیدی اور "اخبار پڑھنا" میرا پیشہ بن گیا۔ نئی نئی سرکاری ملازمت ملی تھی اس لئے ذمہ داری کا احساس اتنا زیادہ تھا کہ ایک ایک اخبار کو دس دس بار پڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ "پوشیدہ امراض" کے دو مخصوص

اشتہارات جو اردو صحافت کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے ہیں مجھے زبانی یاد ہو گئے تھے۔

ان دنوں محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کا دفتر ایک ایسی بلڈنگ میں واقع تھا جو باہر سے تو بلڈنگ نظر آتی تھی مگر اندر جانے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آپ اچانک عہدِ وسطیٰ کے کسی کھنڈر میں آ گئے ہوں۔ محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کی اس بلڈنگ میں نہ کوئی "اطلاع" آ سکتی تھی اور نہ ہی جائز قسم کے "تعلقاتِ عامہ" کی گنجائش تھی۔ بنانے والے نے اس بلڈنگ کو کچھ ایسی بے ترتیبی سے بنایا تھا کہ ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے بھی اجنبی سے لگتے تھے، گویا ہر شخص کی انفرادیت اس بلڈنگ میں محفوظ تھی۔ مجھے یہ تو علم تھا کہ زبیدہ رلوتھر ہمارے محکمہ کے ڈائرکٹر ہیں لیکن کبھی ان کا دیدار کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور نہ ہی میرے دل میں ان کا دیدار کرنے کی خواہش پیدا ہوئی کیونکہ میں جانتا تھا کہ سارے آئی۔ اے۔ ایس عہدیدار ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دو ایک آئی اے ایس عہدیداروں کو آپ ذرا غور سے دیکھ لیں تو بقیہ آئی۔ اے۔ ایس عہدیداروں کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چاول کی ہانڈی میں چاول کے گلنے کا اندازہ لگانے کے لئے دو چار دانوں کو ہی مسل کر دیکھ لینا کافی ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے لوتھر صاحب کا دیدار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، یوں بھی افسر اور ماتحت کا رشتہ اسی وقت لطف دیتا ہے۔ جب یہ رشتہ استوار نہ ہو، کبھی کبھی دفتر کے احاطے سے میں گذرتا تو دیکھتا کہ ایک بڑی سی موٹر کار فراٹے بھرتی ہوئی دفتر کے احاطے میں داخل ہوتی اور ایک خوب رو اور خوش شکل نوجوان بڑی عجلت کے ساتھ موٹر سے اتر کر ڈائرکٹر کے کمرہ میں چلا جاتا۔ اس خوبرو نوجوان کی عمر بڑی مشکل سے ۳۲۔ ۳۴ برس کا لگتا تھا،

اِس کے بعد بھی دو تین بار اِسی طرح ڈائریکٹر کے کمرہ میں جاتے دیکھا تو مجھ میں تجسس پیدا ہوا اور میں نے اپنے ایک عمر رسیدہ ساتھی سے پوچھا۔

" بھئی! یہ ہمارے ڈائریکٹر صاحب آخر کہاں رہتے ہیں۔ وہ خود تو کبھی دفتر نہیں آتے البتہ اپنے بیٹے کو ضرور بھیج دیتے ہیں" میرے ساتھی نے حیرت سے کہا۔

"کون بیٹا! کس کا بیٹا؟"

ہم نے کہا "وہی ڈائریکٹر صاحب کا خوبرو اور حسین و جمیل لڑکا جو ہر تیسرے دن دفتر کی گاڑی میں بیٹھ کر آتا ہے اور ڈائریکٹر کے کمرہ میں چلا جاتا ہے۔"

میرے دوست نے معاملہ کی نزاکت کو تاڑ کر رازدارانہ انداز میں کہا "بھیا! تمہاری نئی نئی نوکری لگی ہے۔ ذرا احتیاط کرنا۔ تم جسے ڈائریکٹر کا لڑکا سمجھ رہے ہو وہی اصل میں اس بیٹے کا باپ بھی ہے۔"

میں نے کہا "کیا مطلب؟"

بولے "میاں! یہی تو وہ نوجوان ہے جس کا نام نریندر لوتھر ہے اور جو ہم سب کا ڈائریکٹر ہے۔"

اِس انکشاف کے بعد میں حیران سا رہ گیا۔ میں نے آئی اے ایس عہدیداروں کے بارے میں جو نظریہ بنا رکھا تھا وہ آن کی آن میں درہم برہم ہوگیا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اتنا خوبرو اور خوش شکل نوجوان بھی آئی اے ایس عہدیدار ہو سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو لوتھر صاحب کو دیکھنے کے بعد ہی میری یہ دیرینہ غلط فہمی دور ہوئی کہ آئی اے ایس کے انتخاب میں "بدصورتی" کو لازمی قابلیت کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک سے بڑھ کر

ایک تو خونخوار اور بدصورت آئی اے ایس عہدیدار کو دیکھنے کے بعد ایک خوش شکل آئی اے ایس عہدیدار کو دیکھنا سچ مچ میرے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔

مگر ایک نقصان یہ ہوا کہ اس واقعہ کے بعد نوتخر صاحب میری نظر میں اچانک ایک عمر رسیدہ آدمی بن گئے۔ عہدہ آدمی کو سب کچھ بنا دیتا ہے۔ تاہم جب بھی انھیں اس طرح موٹر میں آتا دیکھتا تو یوں لگتا جیسے موٹر کی پچھلی نشست پہ محکمہ کا ڈائرکٹر نہیں بیٹھا ہے بلکہ TRANSPARENT شیشے کا ایک مجسمہ رکھا ہے۔ محکمۂ اطلاعات کی اس بوسیدہ اور شکستہ عمارت میں اس قسم کے آدمی کی آمد کچھ عجیب سا احساس پیدا کر دیتی تھی، جیسے ویرانے میں پیچھے سے بہار آ جائے۔ نوتخر صاحب یوں بھی بڑے نفاست پسند واقع ہوئے ہیں۔ اتنے نفاست پسند کہ اپنے دفتر کے سجے سجائے کمرے میں بیٹھتے ہیں تو وہ خود کمرہ کی زینت کا ایک حصہ بن جاتے ہیں اور آدمی کے بجائے کمرہ کی آرائشی اشیاء میں سے ایک شئے نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ ایک آدمی کی نفاست پسندی کی انتہا ہے۔

عجلت پسندی اور وقت کی پابندی نوتخر صاحب کی خاص عادت رہی ہے۔ جب تک محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر رہے، اس قدر وقت پر دفتر پہنچتے تھے کہ ادھر گھڑی کی سوئیاں دس بجانے پہنچنے کے لئے کینبن میں داخل ہوتے اور ادھر ان کی گاڑی دفتر میں داخل ہوتی۔ پھر جب ہم چائے پی کر اور حالاتِ حاضرہ پر دو تین گھنٹے تک خاصی بحث کر لینے کے بعد کینٹین سے نکلتے تو وہ لنچ کے لئے دفتر سے اپنے گھر کے لئے نکلتے (اس سے اندازہ لگائیے کہ ہم لوگ بھی وقت کے کچھ کم پابند نہیں تھے) پھرتی اور عجلت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ موٹر سے اتر کر عام آدمی کی طرح دفتر کی سیڑھیاں نہیں چڑھتے تھے، بلکہ بیک وقت

دو دو تین تین سیڑھیاں ایک ہی جست میں پھلانگ جاتے تھے، غالباً اسی عجلت پسندی اور جست لگانے کی وجہ سے وہ اتنی کم عمری میں ڈائریکٹر بھی بن گئے تھے۔ ان کی ڈائریکٹرشپ اور کم عمری کے ساتھ قدرت نے ایک مذاق بھی کر رکھا تھا۔ یعنی ان دنوں محکمہ میں ان کے اطراف جتنے بھی ڈپٹی ڈائریکٹرس اور اسسٹنٹ ڈائریکٹرس تھے وہ سب کے سب ان سے عمر میں کم از کم ڈھائی گنا بڑے تھے۔ مشہور تھا کہ محکمۂ اطلاعات اصل میں "بیت المعذورین" ہے۔ ایسے عہدیداروں کی اکثریت تھی جو ایک سال یا چند مہینوں میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریٹائرمنٹ سے کم از کم ایک سال پہلے سرکاری عہدیدار کی زندگی میں کچھ ایسی خاموشی چھا جاتی ہے جو طوفان کے آنے سے پہلے عموماً سارے ماحول پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہ عہدیدار دفتر کی ساری فائلیں اپنے کمرے میں جمع کرتے جارہے تھے اور اس نئے عہدیدار کا انتظار کر رہے تھے جو ایک سال بعد آکر ان فائلوں کو نپٹا دے گا۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے عہدیداروں کو قبل از وقت وہ بیماریاں لاحق ہو گئیں جو عموماً ریٹائرمنٹ کے بعد انسان کے مقدر کا حصہ بنتی ہیں۔ ایک صاحب کی کمر میں مستقلاً درد رہتا تھا۔ ایک صاحب کو بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ ایک صاحب کھانسنے تو بس کھانستے ہی چلے جاتے تھے۔ اتنی طویل کھانسی شاید ہی ہندوستان بھر میں کوئی کھانستا ہو۔ ایسے "نیم خوابیدہ" ماحول میں اچانک نوتعر صاحب آگئے تو دفتر کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دفتر کے یہ پرانے اور گھاگ جن بڑی آسانی سے نوتعر صاحب کو کچھ پتلی بنا دیں گے۔ مگر نوتعر صاحب نے آتے ہی ان بڈھوں کی ڈبریاں کسنی شروع کر دیں اور بس کستے ہی چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن صاحب کی کمر میں ریٹائرمنٹ

کی آمد کا ورد مستقلاً رہا کرتا تھا وہ اب اتنے چاق و چوبند ہو گئے کہ ہم جیسے نوجوانوں سے آنکھ ملا کر نہ صرف بات کرنے لگے بلکہ آنکھ بھی مارنے لگے۔

وہ صاحب جن کی تاریخی کھانسی کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلتی چلی جاتی تھی وہ سکڑ کر اتنی مختصر ہو گئی کہ خود انھیں بھی اس کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ایک دن کسی نے ان کی عہد رفتہ کی کھانسی کا حال پوچھا تو جل کر فرمانے لگے،

" بھئی! جب سے یہ نئے ڈائریکٹر صاحب آئے ہیں، کھانسنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ دن بھر میں کھانسنے کے لئے بڑی مشکل سے دس پندرہ منٹ ملتے ہیں اور ان منٹوں میں بھی مجھے دوپہر کا کھانا کھانا پڑتا ہے۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے کہ سارا سارا دن اطمینان سے بیٹھے کھانسا کرتے تھے۔ اور کوئی پلٹ کر نہیں پوچھتا تھا کہ میاں کیوں کھانسے جا رہے ہو اور کس پہ کھانس رہے ہو؟" جن صاحب کا بلڈ پریشر "لو" رہا کرتا تھا ان کی تو کایا ہی پلٹ ہو گئی۔ یعنی اب انھیں "لو" کی بجائے "ہائی پریشر" رہنے لگا۔ تو نقر صاحب اس محکمے کے لئے سچ مچ "مسیحا" بن کر آئے تھے۔ کیوں کہ ان کے آتے ہی دفتر کے اکثر ملازمین کے کہنہ امراض غائب ہو گئے تھے۔ وہ محکمۂ اطلاعات جو اندھا دھند دینی کے نظم و نسق کے نقشہ سے تقریباً معدوم سا ہونے لگا تھا۔ اب نقشے میں اتنا پھیلنے لگا کہ اس پر "چین" کا گمان ہونے لگا۔ آئے دن نئی نئی اسکیمیں بننے لگیں نئے نئے شعبے کھلنے لگے۔

مجھے یاد ہے کہ تو نقر صاحب نے ٹیلیفون پر عوام کو مختلف قسم کی معلومات اور اطلاعات فراہم کرنے کا بھی ایک شعبہ بنا رکھا تھا۔ اس شعبے کے ذمے یہ کام تھا کہ ٹیلیفون

پر جو بھی سوال پوچھا جائے اس کا جواب دے دیا جائے۔ جو صاحب عوام کو معلومات فراہم کرتے تھے۔ وہ چند ہی دنوں میں بیمار ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ میرے عہدیدارِ متعلقہ نے اس خوش فہمی میں کہ میری "معلوماتِ عامہ" کافی اچھی ہیں مجھے اس کام پر بٹھا دیا۔ اب آپ سے کیا بتاؤں کہ ایک ہی دن میں میری کیا حالت ہوئی۔ دن بھر میں جو سیکڑوں سوال اس انفارمیشن سروس سے پوچھے گئے، ان میں سے چند آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔

ایک صاحب نے پوچھا "یہ بتایئے کہ بیدر کے لئے بس کہاں سے ملے گی، اور بیدر کا کیا کرایہ ہے؟"

ایک خاتون نے جو ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر بے حد گھبرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، پوچھا "پلیز، ذرا سنئے، میرے شوہر کل رات سے گھر واپس نہیں ہوئے ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟ میں نے کہا آپ پولیس کو فون کیوں نہیں کرتیں؟ اس پر کہنے لگیں "ایسے معاملوں میں بھی پولیس کو فون کرنا پڑے تو پھر آپ کے محکمہ کی "انفارمیشن سروس" سے کیا فائدہ؟ آپ کی معلوماتِ عامہ آخر کس دن کام آئیں گی؟

فون رکھ کر میں جو وہاں سے بھاگا تو پھر کبھی "انفارمیشن سروس" کا رخ نہ کیا۔ اس انفارمیشن سروس کے بارے میں یہ لطیفہ بھی مشہور تھا کہ ہر روز ایک خاتون کا ٹیلی فون آتا ہے اور وہ پوچھتی ہیں "کیا اس وقت آپ کے ڈائرکٹر صاحب دفتر میں موجود ہیں؟" جواب "ہاں" میں ہوتا تو فون فوراً بند ہو جاتا۔ اور اگر "نہیں" میں ہوتا تو پوچھا جاتا۔ "کہاں گئے ہیں؟ کب گئے ہیں؟ کس کے ساتھ گئے ہیں؟"

دن میں تین چار مرتبہ ایسا فون ضرور آجاتا. متعلقہ عہدیدار حیران رہ جاتا کہ آخر یہ کون مذاق کرتا ہے، راوی کا بیان ہے کہ یہ مذاق قطعاً نہیں تھا. بلکہ یہ فون اصل میں مسٹر نریندر نوظفر کا ہوتا تھا، کسی نے سچ کہا ہے، شکاری بعض اوقات خود اپنے ہی جال میں پھنس جاتا ہے۔

نوظفر صاحب کو میں نے "شیشہ کا آدمی" کہا ہے مگر ہیں وہ بڑے آہنی آدمی ــــ اُن کی فرض شناسی اور دلیری کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے کہ محکمۂ اطلاعات کی جانب سے حیدرآباد میں روسی سرکس کے ایک شو کا اہتمام کیا گیا تھا، اس کیلئے ایک بہت بڑی گیلری تعمیر کی گئی تھی تاکہ تماشائی آس پہ بیٹھ سکیں یہ سرکس کا مظاہرہ جاری تھا اور غالباً شیروں کے کرتب دکھلائے جا رہے تھے کہ اچانک گیلری سجدہ میں گر پڑی۔ ہزاروں تماشائی آن کی آن میں نیچے آرہے۔ روشنی گل ہوگئی۔ لوگوں کی چیخ و پکار میں شیروں کی چیخ و پکار صاف سنائی دے رہی تھی۔ لوگ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے لگے۔ اندھیرے میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی آپ کے بازو جو بیوی بیٹھی ہوئی تھی اب وہاں ایک شیرنی آکر بیٹھ گئی ہے۔ محکمہ کے ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے بارے میں یہ لطیفہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ انھوں نے شیر کے خالی پنجرے میں پناہ حاصل کرنے کے بعد پنجرہ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا اسلئے نہیں کہ کہیں شیر پنجرے میں آجائے گا بلکہ اس ڈر سے کہ کہیں بیوی اس پنجرے میں نہ آجائے۔ اس افراتفری میں کیسی ذمہ داری اور کیسے فرائض منصبی؛ عوام کے ساتھ ساتھ محکمہ بھی بھاگ گیا. مگر جب دوبارہ روشنی آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ نوظفر صاحب پسینے میں نہلائے جا رہے ہیں. اور گیلری کے نیچے سے عبادت میں مصروف لوگوں کو نکالنے میں مصروف ہیں، یوں لگتا تھا

جیسے روسی فنکاروں کی آؤ بھگت کو تھر صاحب اپنے کرتب دکھانے پہنچ گئے۔ یوں دروغ برگردنِ راوی، تو تھر صاحب کے دشمنوں میں یہ بات بھی مشہور ہو گئی تھی کہ جیسے ہی گیلری گری اور روشنی گل ہوئی، تو تھر صاحب روسی [illegible] جیسی خاتون فنکاروں کو بہلانے کے لئے درست اور [illegible] آنکھنا بچاتے تھے۔ اُن کی شخصیت کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ وہ اردو کے زبردست ادیب [illegible] ہیں۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے تھر صاحب کے انگریزی مضامین بھی پڑھے ہیں، انگریزی زبان کے معاملے میں وہ "اہلِ زبان" کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئیے کہ یوپی کی انگریزی بولتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو میں طرحیہ مضامین لکھنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس مہذب پنجابی کے ساتھ سے بہت مشابہ ہے جسے لندن کی ایک شاہراہ پر کسی انگریز نے بُری طرح تکرار سے [illegible] پنجابی نے غصہ کے مارے انگریز کو انگریزی زبان کی ساری گالیاں دے ڈالیں [illegible] پھر تھوڑی دور گیا اور پھر پلٹ کر انگریز کے پاس آیا اور کہنے لگا ــــــــ

"AND MOREOVER" اوئے کتے دا پتر۔ تیری کڑی نوں [illegible]" اس گالی کو دینے کے بعد اس کی ذات میں چھپا ہوا ہیجان یوں کم ہو گیا جیسے سمندر کا جھاگ اچانک بیٹھ جاتا ہے۔ تو تھر صاحب کے لئے اردو "AND MORE OVER" کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جب تک وہ اردو میں اپنے من کی بات کا اظہار نہیں کرتے تب تک انھیں چین نہیں آتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر مجھے اتنی اچھی انگریزی آتی جتنی کہ تھر صاحب کو تو اردو میں قطعاً نہ لکھتا۔ "اینڈ مور اوور" اردو میں لکھنا ایسا بھی کیا

ضروری ہے۔ میں یہ راز بھی افشا کرتا چلوں کہ جب تک وہ محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر رہے تب تک میں نے اپنی "شناخت" کو بڑے جتن کے ساتھ اُن سے پوشیدہ رکھا۔ وہ مجھے میرے عہدے یعنی اردو نیوز ریڈر کے رشتے سے ہی جانتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ "سیاست" اخبار میں جب اُن کی پہلی کتاب "بند کواڑ" پر لکھا ہوا میرا تبصرہ شائع ہوا تو انھوں نے کہلا بھیجا "اردو نیوز ریڈر" سے کہو کہ آج کے "سیاست" میں مجتبیٰ حسین کا جو تبصرہ شائع ہوا ہے اس کا تراشہ لے کر بھجوائے" اور میں نے مجتبیٰ حسین کے تبصرہ کا تراشہ اُن کی خدمت میں یوں پیش کیا تھا جیسے میں مجتبیٰ حسین کو بالکل نہیں جانتا۔

اوتھکر صاحب کے محکمۂ اطلاعات سے جانے کے بعد میں اُن سے قریب ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ میں نے سوچا کہ اب اُن سے قریب ہونے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔ دفتر میں وہ عہدیدار بن جاتے ہوں تو ہوں، مگر عام زندگی میں وہ ایک سیدھے سادے بے تکلف اور کھلے ذہن کے آدمی ہیں۔ اُن کے مزاحیہ مضامین کی بے تکلف اور خوشگوار فضا اُن کے گھر میں بھی پائی جاتی ہے ورنہ میں نے اکثر ایسے ادیب بھی دیکھے ہیں جو اپنے مضامین میں خوشگوار فضا محض اس لئے پیدا کرتے ہیں کہ انھیں یہ فضا اپنے گھر میں میسر نہیں آتی۔ اُن کے مضامین میں جا بجا آپ کو کتوں کا ذکر ملے گا۔ اُن کے ایک مضمون کا عنوان ہی "ایک شریف کتے کا خط آدمی کے نام" ہے۔ مجھے "شریف کتے" کی اصطلاح کچھ عجیب سی لگی۔ ہم اردو والے تو کتوں کو بیطرس بخاری کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اردو کتا تو بڑا غیر شریف ہوتا ہے لیکن جب

تونسوی صاحب کے گھر کئی بار جانے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ کتا شریف بھی ہو سکتا ہے بلکہ تونسوی صاحب اسے پالیں۔ یہ اُن کی شائستگی اور خوش اخلاقی کا ثبوت ہے۔ کہ کتا بھی اُن کی صحبت میں رہ کر شائستہ مہذب اور خوش اخلاق بن جاتا ہے۔ یوسفی نے کہیں لکھا ہے کہ کتے کے جسم میں سے اگر جبڑا نکال لیا جائے تو یہ خاصا شریف جانور ہے۔ تونسوی صاحب کے ہاں جو بھی کتا آتا ہے۔ اُسے یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ اُس کے منہ میں جبڑا بھی ہے، میں نے کبھی اُن کے کتے کو بھونکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگرچہ تونسوی صاحب نے اپنے ایک اور مضمون میں لکھا ہے کہ بڑے عہدیدار کتے کو صرف اس لئے پالتے ہیں کہ وہ اُنھیں بھونکنا سکھا سکے۔ اس معاملہ میں میری رائے یہ ہے کہ تونسوی صاحب اپنے کتے سے کم سیکھتے ہیں اور کتا اُن سے زیادہ سیکھتا ہے۔ ایک بار جب میں اُن کے گھر گیا تو دیکھا کہ اُن کا کتا ایک درخت کے نیچے بیٹھا بکری کی طرح جگالی کر رہا ہے میں کتوں سے بہت گھبراتا ہوں۔ اسے دیکھ کر واپس جانا چاہتا تھا کہ تونسوی صاحب کے ملازم نے کہا "صاحب! اس کتے سے نہ ڈریئے یہ کتا تو بالکل گدھا ہے۔ نہ بھونکتا ہے، نہ کاٹتا ہے۔ ایسا اہنسا وادی کتا آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ یہ چوکیداری نہیں کرتا بلکہ صرف افسری کرتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چوکیداری کا کام بھی نہ صرف مجھی کو کرنا پڑتا ہے، بلکہ ہنگامی حالات میں دم بھی ہلانی پڑتی ہے"۔ تونسوی صاحب کے بچوں کو بھی یہ شکایت رہتی ہوگی کہ اُن کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے اُن کا کتا بگڑ رہا ہے۔ یہ بات درست بھی ہے، کیونکہ تونسوی صاحب کبھی اپنے بچوں کے ساتھ بے جا لاڈ پیار نہیں کرتے۔ میں نے تپتی ہوئی دھوپ میں اُن کے لڑکے کو سائیکل

پر اپنے اسکول جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

وہ گھر کو بڑی سادگی سے سجانے کے قائل ہیں، وہ دیگر بڑے عہدیداروں کی طرح گھر کے نام پر "میوزیم" میں نہیں رہتے۔ اُن کے ڈرائنگ روم میں کتابوں کی بڑی بڑی الماریاں رکھی ہیں اور میں نے خود ان کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا ہے اُن کے سارے اوراق پھٹے ہوئے پائے گئے۔ اُن الماریوں کے جائزے سے بھی اردو کے لئے اُن کی محبت کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ وہ اردو کتابوں کو زیادہ نمایاں مقام پر رکھتے ہیں، میں تو یہ کہتا ہوں کہ گوتھر صاحب اپنی لائبریری میں اردو کتابوں کو جو مقام دیتے ہیں وہی مقام اگر حکومت اردو کو دینے لگے تو اردو کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔

وہ بڑے خوش مزاج آدمی ہیں۔ بات بات پر فقرے چست کرتے ہیں مزاح نگار ہونے کے ناطے سنجیدہ بات میں بھی مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں، لیکن مجھے یہ کہنے دیجئے کہ قدرت بھی اُن کے ساتھ کچھ کم مذاق نہیں کرتی۔ گذشتہ سال گرمیوں میں دو مہینے کی چھٹی لے کر خوش خوش دہلی آئے۔ پہلے سے اُنھوں نے مجھے خط لکھ رکھا تھا کہ میں فیملی سمیت دہلی سے سکّم جا رہا ہوں، کچھ عرصہ کیلئے میں کلچر، سوسائٹی اور سویلائزیشن CIVILIZATION سے دُور جانا چاہتا ہوں۔ وہاں جاکر خوب آرام کروں گا، خوب کھاؤں گا، خوب پیوں گا (پانی) خوب لکھوں گا، خوب سیر کروں گا اور نیچر سے قریب ہو جاؤں گا۔ میں نے بدھائی دی اور وہ اپنی چھٹیوں کا مبارک پروگرام لے کر سکّم کی جانب روانہ ہو گئے۔ کہہ گئے تھے کہ سکّم کی پہاڑیوں سے اتر کر پھر مہذب دنیا کے

میدانوں میں آؤں گا تو میرے ساتھ مضامین کے بھاری مسودے ہوں گے، خبردار ہوشیار! کئی دن بیت گئے، مگر سکم سے توقیر صاحب کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ سچ مچ سویلائزیشن سے دور اور کچھڑ سے قریب ہو گئے ہیں، مگر ایک دن اُن کی خوبصورت ہینڈرائٹنگ میں اُن کا خط آیا۔ لکھا تھا "جب سے سکم آیا ہوں بستر پر دراز ہوں بلکہ راستہ میں ہی بستر پر دراز ہو گیا تھا، بستر علالت پہ لیٹے لیٹے ہی بستر سمیت سکم پہنچا اور اب تک لیٹا ہوا ہوں۔ چکن پاکس (CHICKEN POX) ہو گئی ہے۔ میرے بچے بھی اس بیماری میں میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ بڑی سعادت مند اولاد ہے! اس لئے ڈھارس بندھی رہتی ہے۔ میں سویلائزیشن سے دور جانے کی غرض سے سکم آیا تھا مگر سویلائزیشن خود چکن پاکس کی شکل میں میرے پاس آگئی ہے۔ سویلائزیشن سے نجات ممکن نہیں، یہ کبھی چکن پاکس بن کر آتی ہے اور کبھی آرٹ اور لٹریچر بن کر آتی ہے بلکہ بعض اوقات تو چکن پاکس اور آرٹ و لٹریچر میں فرق کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

میں نے خط پڑھ کر فوراً دور رکھ دیا کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں توقیر صاحب کی ہینڈرائٹنگ کے توسط سے سویلائزیشن میرے قریب بھی نہ پہنچ جائے، ڈیڑھ ماہ بعد دہلی آئے تو بڑا۔ دن کیا۔ میں اُن سے ملنے بلکہ مزاج پرسی کرنے گیا تو دیکھا کہ ایک باریش آدمی بڑی بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کر رہا ہے۔

میں نے پوچھا "توقیر صاحب ہیں؟"

جواب ملا "مائنڈ یو! توقیر ہی آپ سے مصافحہ کر رہا ہے۔"

میں انھیں دیکھ کر حیران رہ گیا کیوں کہ اُن کے چہرے پر کم از کم ایک فٹ لمبی

داڑھی بڑھ آئی تھی اور وہ اپنی وضع قطع سے "قدیم یونانیوں" کی طرح لگ رہے تھے۔

میں نے کہا لگتا ہے سیکم جانے کے بعد آپ سچ مچ نیچر سے بہت قریب ہو گئے تھے!"

ہنس کر کہنے لگے "بستر پہ لیٹے لیٹے نیچر سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ لگتا تھا، نیچر کا ہی حصہ بن جاؤں گا!"

نوبہار صاحب کو اِس رُوپ میں شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ شیشہ کے آدمی تو وہ تب بھی لگ رہے تھے۔ مگر داڑھی کی وجہ سے ان کے چہرے پر ایک راہبانہ نشان اُبھر آئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں مشہور انگریزی فلم ——————

TEN COMMANDMENTS کے ہیرو کو دیکھ رہا ہوں۔

چھٹیاں منانے کی حسرت دل میں لئے ہوئے وہ پھر سے بلائزیشن کے قریب آ گئے اور اِس حد تک قریب آ گئے کہ حیدرآباد پہنچنے کے بعد انھیں حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کا کمشنر بنا دیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوبہار صاحب حیدرآباد کے شہریوں کے لئے ملی ہوئی واحد "بلدی سہولت" ہیں۔ سُنا ہے کہ اب وہ ہر محلہ کا شخصی طور پہ دورہ کرتے ہیں اِس دورے کے دو فائدے ہوتے ہیں، پہلا فائدہ تو یہ کہ کم از کم اُن کے دورہ کے پیشِ نظر محلہ کی صفائی ہو جاتی ہے۔ اور دوسرا فائدہ یہ کہ گندی بستیوں کے بچوں کو اُن کی دورہ کرنے والی موٹر کے پیچھے بھاگنے بلکہ اُس کے بمپر پہ بیٹھ کر سواری کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ یہ بھی تو آخر ایک بلدی سہولت ہے

بہت دن پہلے نوبہار صاحب نے ایک معرکتہ الآراء مضمون "حیدرآباد کا تغزانیہ"

لکھا تھا، قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اب وہی اس شہر کے "جغرافیہ" اور "تغرافیہ" کے کرتا دھرتا بن گئے ہیں۔ سنا ہے کہ انھوں نے کمشنر بلدیہ بنتے ہی بلدیہ کے حالات پر نہ صرف قابو پانے کی کوشش شروع کردی ہے بلکہ مزاح نگار رشید قریشی اس بات کے راوی ہیں کہ انھوں نے ایک جہاں دیدہ بزرگ سے رازدارانہ انداز میں "بلدیہ۔ کھایا پیا چلدیا" کے قدیم محاورے کے معنی بھی پوچھے ہیں۔ انھیں معنی بتلادیے گئے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ تو تھر صاحب کو ایک بار معنی سمجھ میں آجائیں تو وہ اپنے ماتحتین کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔

(سنہ ۱۹۷۴ء)
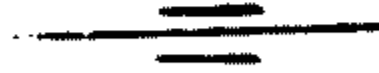
باقی کے بارے میں میرے خاکہ کو جولیس سیزر کی نعش کے آگے مارک انطونی
کی اس تقریر کی طرح نہ لیا جائے جس میں ہر تھوڑی دیر بعد یہ جملہ آتا ہے:

YET BRUTUS IS AN HONOURABLE MAN

باقی کو میں نے جس طرح اور جس حد تک دیکھا، پایا اور سنا ہے وہ سب
کچھ اس خاکے میں ہے۔

ایک باقی وہ جو باقی ہے، دوسرا باقی وہ جو منجمد ہے۔
باقی جس کے "مکمل" میں میں پوری شخصیتیں بیٹھی ہوئی ہیں اور ایک باقی
وہ جو آپ اپنا تذبذب اور خود اپنا فیصلہ ہے (یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ باقی
نے اپنے مجموعۂ کلام کے آخر میں "میرا مکمل پتہ" کے عنوان کے تحت اپنے "میں"

ہیں نورتنوں کو یوں شامل کیا ہے جیسے اکبر نے اپنے درباریوں میں نورتنوں کو جمع کیا تھا۔ مگر اب زمانہ جمہوریت کا آگیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ نورتن باقی کے دربار کے ہیں یا باقی ہی ان نورتنوں کے دربار کے واحد رتن ہیں)

باقی جو ایک رو بہ زوال زبان میں ترقی کر رہا ہے۔

باقی جو دو بیچیڑیوں کے سہارے کے بغیر چند قدم نہیں چل سکتا اور باقی جسے اندھی اڑانوں کا شوق ہے۔

باقی جو دوسروں کی زبانی اپنی تعریف سن کر مطمئن نہیں ہو جاتا بلکہ خود اپنی تعریف کرکے خوش ہوتا ہے ؎

نظر ہیں، آئینہ ہیں، سماعت ہیں، صدا ہیں

باقی جو زندگی سے لڑتا ہے، باقی جو زندگی سے جھگڑتا ہے۔

باقی جو چھیلنے پہ آئے تو اپنے مخلص دوست راج نارائن راز کے نام کا آسان فارسی ترجمہ "دم گفتگو صد سخن معتبر راز" کر ڈالے اور باقی جو تھمنے پہ آئے تو خود اپنا ترجمہ یوں کرے ؎

کبھی ایک پل بھی نہ سانس لی کھل کے ہم نے باقی
رہا عمر بھر بسکہ جسم دجاں میں عذاب سا کچھ

باقی جسے ادب میں مقام مل چکا ہے۔ باقی جسے ادب میں مقام چاہیئے۔

باقی جو زندگی کے حساب کے معاملہ میں اپنے بہاجنی خد و خال کے باوجود "تجا" مگر زندگی کا حساب ضرور مانگتا ہے۔

باقی جو دوستوں پر مر مٹتا ہے۔ باقی جو دوستوں سے نفرت کرتا ہے۔

یہ قصہ اسی باقی کا ہے اور میں اس قصہ کو ذرا پہلے سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔

دس گیارہ سال اُدھر کی بات ہے میرے اور باقی کے مشترک دوست کیلاش ماہر کسی سرکاری کام کی آڑ میں حیدر آباد آئے اور تین چار مہینے تک یہیں کے ہو رہے ان کا ایک ناپسندیدہ معمول یہ تھا کہ مجھ سے ہر روز ملتے تھے۔ دوسرا ناپسندیدہ معمول یہ تھا کہ ہر شام شراب پیتے تھے **تیسرا معمول یہ تھا** کہ جیسے ہی دو پیگ پی لیتے انھیں اچانک باقی کی نہیں بلکہ "باقی ایم اے" کی یاد آجاتی تھی اور کہتے "بھئی لو تمھیں باقی ایم۔ اے کے کچھ شعر سنائیں تم بھی کیا یاد کروگے"۔ چوتھے پیگ تک وہ لگاتار باقی کے شعر سنایا کرتے تھے اور ان شعروں پر اپنا ہی سر کچھ اس زور سے دھنتے تھے کہ بار کے بیرے تک باقی کے شعروں کے وسیلے سے ان میں دلچسپی لینے لگتے تھے۔ چوتھے پیگ کے بعد ان میں کچھ ایسی دیدہ دلیری پیدا ہو جاتی تھی کہ اپنے شعر سنانے پر اتر آتے تھے۔ یہ افراتفری پانچویں پیگ تک باقی رہتی تھی۔ اس کے بعد ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں والا معاملہ درپیش آتا تھا کیونکہ اس کے بعد وہ میر، غالب، مومن، ذوق، اور نہ جانے کن کن شعرا کے اشعار سنانے لگتے تھے۔ میں ان کے پانچویں پیگ والے شعروں پر داد دیتا تو نہایت مودبانہ انداز میں سلام کر کے داد وصول کر لیا کرتے تھے۔ پھر فلیش بیک کے طور پر انھیں اچانک باقی کی یاد آجاتی تھی اور وہ چلا کر کہتے "باقی ہائے باقی" چونکہ اس نعرہ میں ایم۔ اے شامل نہیں ہوتا تھا اس لیئے بار کے بیرے "پانی" کے گلاس لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ ہر شام کا ڈراپ سین یہی ہوتا تھا۔

البتہ ان کا آخری معمول یہ ہوتا تھا کہ بچھڑنے سے پہلے مجھ سے ضرور پوچھتے "کیا تم نے باقی ایم اے کو پڑھا ہے؟" اور میں کہتا "نہیں نے باقی کو پڑھا ہے اور نہ ایم اے تک پڑھا ہے۔"

اس پر وہ کہتے "تم ایک بار باقی ایم اے کو ضرور پڑھو پھر تمہیں ایم اے تک نہ پڑھنے کا ملال نہیں رہے گا۔"

باقی سے یہ میرا پہلا بالواسطہ تعارف تھا۔ باقی اور باقی کے کلام کے بارے میں کیلاش ماہر نے کچھ ایسی "تبلیغی فضا" قائم کر رکھی تھی کہ فطری طور پر باقی کا کلام پڑھتے ہوئے ڈر ہوتا تھا۔ پھر جو ادیب اور شاعر اپنے نام کے ساتھ اپنی تعلیمی قابلیت بھی بالالتزام لکھتے ہیں۔ ان کی چیزیں پڑھنے کو یوں بھی جی نہیں چاہتا۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کسی نصابی کتاب کا سبق پڑھ رہے ہوں۔ مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا۔ چھ سات سال پہلے جب سلیمان ادیب کا انتقال ہوا تو ہم ان کی آخری رسومات کے سلسلہ میں قبرستان گئے۔ تدفین میں ابھی کچھ دیر تھی تو ہم لوگ اس شہر خموشاں کی قبروں کا معائنہ کرنے لگے۔ ایک قبر پر قبر کے مکین کا نام لکھا تھا اور اس کے آگے مرحوم کی تعلیمی قابلیت کچھ اس طرح لکھی تھی۔ ایم اے (علیگ) ڈی لٹ (آکسفورڈ) بار ایٹ لا (کیمبرج) اس کتبہ کو دیکھ کر میرے ایک دوست نے کہا تھا "بھئی بھاگو یہاں سے یہاں تو علم کا خزانہ دفن ہے۔" اور میں سچ مچ وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ زندوں کی تعلیمی قابلیت کو تو چھوڑ دیئے مجھے تو مردوں کی تعلیمی قابلیت سے بھی الجھن سی ہوتی ہے۔ یوں بھی تجربے میں آیا ہے کہ شاعر بہت زیادہ پڑھا لکھا ہو تو پھر شعر کہنے کی اہمیت نہیں رکھتا۔

پڑھا لکھا آدمی تو کوئی بھی شریفانہ کام کر سکتا ہے شاعری کیوں کرے؟ ویسے اب تو باقیؔ نے اپنے نام کے آگے ایم اے لکھنا ترک کر دیا ہے مگر کچھ برس پہلے تک وہ لوگوں کو اپنی شاعری کے علاوہ اپنی تعلیمی قابلیت سے بھی دھمکاتے تھے۔

نومبر ۱۹۷۲ء میں جب میں دہلی آیا تو اس وقت تک میں نے ڈرتے ڈرتے باقیؔ کا تھوڑا بہت کلام پڑھ لیا تھا۔ اور آج سر بزم اس راز کا انکشاف کرتا چلوں کہ مجھے ان کا کلام بے حد پسند آیا تھا۔ دل میں اندیشہ تھا کہ باقیؔ سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ملاقات ہوگی۔ لہٰذا سوچا کہ ان کا مزید کلام پڑھ لینا چاہیے۔ اگر وہ اپنی شاعری کے بارے میں کبھی کوئی سوال پوچھ بیٹھیں، اور میں معقول سا جواب نہ دے سکوں تو سبکی ہوگی یوں بھی دور اندیش آدمی خطرہ کو پہلے ہی بھانپ لیتا ہے۔ میں باقیؔ کے کچھ شعر یاد کرکے اور ان کے کلام کے بارے میں اپنی رائے پر مبنی چند جملے تراش کر دلی میں بلا خوف و خطر گھومتا رہا کہ باقیؔ اب جہاں چاہیں میں وہ مجھے یوں غفلت میں نہ پائیں گے۔ مگر ایک دن کسی نے بتایا کہ باقیؔ ان دنوں موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور ایک ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ مجھے بڑا دکھ ہوا کہ میں نے امتحان کی طرح جو تیاری کی تھی وہ سب کی سب اکارت گئی۔ میں نے یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ کس بیماری میں مبتلا ہیں۔ کب سے بیمار ہیں کیوں بیمار ہیں اور کب تک بیمار رہیں گے۔ شاعروں کی بیماری کے بارے میں یوں بھی کچھ نہیں پوچھنا چاہیے کیونکہ ہمارے ملک میں شاعر جب بھی بیمار ہوتا ہے کسی مہلک بیماری ہی میں مبتلا ہوتا ہے۔ باقیؔ کے اکثر دوست پریشان کی عیادت کو جاتے بلکہ بعض دوست تو انہیں دیکھنے کے لیے یوں خوشی خوشی

جلتے جیسے باقی کو دیکھنے نہ جا رہے ہوں کوئی فلم دیکھنے جا رہے ہوں. غرض باقی چار پانچ مہینوں تک ہسپتال میں زبردست "رش" لیتے رہے مگر میں انھیں دیکھنے نہیں گیا. آدمی کتنا خود غرض اور زندگی کتنی ظالم چیز ہے۔

پھر بہت عرصہ بعد ماونکر ہال میں ریڈیو کے ایک مشاعرہ میں انھی جناب "دم گفتگو صد سخن معتبر رازؔ" نے میرا تعارف باقی سے کرایا. باقی انہی دنوں ہسپتال سے چھوٹ کر آئے تھے. نقاہت کے باوجود بڑی گرم جوشی سے ملے پھر شکایت کی" بھئی ہم ہسپتال میں مہینوں تک موت سے لڑتے رہے مگر تم نے خبر تک نہ لی حالانکہ تمھیں دلی آئے ہوئے تو کئی مہینے بیت گئے"!

باقی شکایت کرتے رہے اور میں نظر جھکائے باقی کے کلام کے بارے میں ان جملوں کو یاد کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا جو میں نے کبھی حفظ کر رکھے تھے. خدا دشمن کو بھی کمزور حافظہ نہ دے۔

باقی ان دنوں چھوٹی بحر کا مصرعہ بن گئے تھے. ہاتھ میں ایک چھڑی بھی آ گئی تھی جو اس مصرعہ کو وزن سے گرنے نہیں دیتی تھی. چھڑی کیا تھی ایک خاصی ضرورت شعری تھی. اس وقت باقی کے حساب رنگ میں ایک ہی رنگ جڑا ہوا تھا اور وہ تھا زرد رنگ. یوں لگتا تھا جیسے باقی باقی نہیں ہلدی کی گانٹھ ہیں۔

ان کے اندر بیٹھے ہوئے شاعر نے موت سے جو فیصلہ کن جنگ لڑی تھی اس کے آثار اب تک ان کے چہرے پر عیاں تھے. باقی کو آج دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ اس زرد رنگ کو پھلانگ کر اب زندگی سے پھر رنگوں کا حساب مانگنے لگے ہیں۔

پھر باقی سے کافی ہا دسں۔ ادبی جلسوں اور مخصوص بیٹھکوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔

باقی کو میں نے ہردم ایک سیدھے سادے اور معصوم آدمی مگر ایک سرکش اور چوکس شاعر کے روپ میں پایا۔ ایسا شاعر جس کے سامنے ہردم اس کی شاعری رہتی ہے۔ باقی کی شاعری مال عرب ہے جو ہمیشہ پیش عرب رہتا ہے۔

باقی اصل میں چوبیسوں گھنٹوں کے شاعر ہیں۔ دن بھر میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا جس میں باقی شاعر نہ رہتے ہوں۔ ہر لمحہ انھیں یہ احساس رہتا ہے کہ وہ شاعر ہیں اور شاعر بھی ایسے ویسے نہیں بہت بڑے شاعر۔ جب بھی ملیں گے اپنی شاعری کے فوائد سے لوگوں کو یوں واقف کرائیں گے جیسے ان کی شاعری نہ ہو کوئی مجرب نسخہ ہو۔ پھر یہ بھی کہیں گے۔ "یار ہم نے اردو شاعری کو اتنا سب کچھ دیا ہے۔ بتاؤ آخر کب ہماری قدر ہوگی؟" مخاطب نقد جیسا ہوگا تو کہے گا "باقی صاحب جس زبان میں آپ شاعری کرتے ہیں اسے ذرا ختم تو ہو لینے دیجئے ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اس کے بعد آپ کی قدر ضرور ہوگی" اور اگر مخاطب معصوم اور بھولا بھالا ہوگا تو کہے گا "باقی صاحب آپ تو ESTABLISHED شاعر ہیں۔ پھر آپ کو یہ گلہ کیوں کہ آپ کی قدر نہیں ہو رہی ہے" لیکن اس کے باوجود باقی زمانہ کی بے مہری کا شکوہ کرتے رہیں گے۔ پھر اچانک اپنی جیب سے بیڑی نکال کر اسے جلاتے ہوئے اپنا ایک شعر پڑھ دیں گے۔ اور مخاطب کے چہرہ پر بیڑی کا دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھیں گے "ہے کسی کی مجال جو ایسا شعر کہہ کر دکھا دے؟"

اردو غزل میں مقطع کی ایجاد صرف اس لئے ہوئی تھی کہ شاعر اس میں حسب

استطاعت اپنی تعریف و توصیف کرے۔ لیکن باقی اپنی تعریف کے لئے مقطع کو نا کافی سمجھتے ہیں۔

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اسی لئے وہ عام نثری بات چیت میں بھی ہر دم مقطع ہی کہتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں دہلی آنے کے بعد میں نے باقی کے کلام کے بارے میں اپنی رائے پر مبنی چند جملے تراش لئے تھے۔ چاہتا تھا کہ کبھی یہ توصیفی کلمات باقی کے گوش گزار کروں گا۔ مگر باقی جب بھی ملے وہ اپنے کلام کے بارے میں اپنی ہی رائے کو مجھ پر ظاہر کرنے میں اس قدر مصروف رہے کہ کبھی مجھے اپنی ناچیز رائے کے اظہار کا موقع ہی نہیں دیا۔ بلکہ یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ جو جملے میں نے تراش رکھے تھے ہو بہو وہی جملے باقی اپنے بارے میں کب کے کہہ چکے ہیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

باقی کے اسی وصف کی وجہ سے میں نے دیکھا ہے کہ لوگ ان کی پیٹھ پیچھے تعریف کرتے ہیں اور ان کا سامنا ہو تو منہ لٹکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے اس نفسا نفسی کے زمانہ میں پیٹھ پیچھے تعریف کیسے ملتی ہے۔ باقی کی غیر موجودگی میں میں نے ہر دوست سے باقی کے کلام کے بارے میں رائے پوچھی ہے اور آج تک ایک بھی شخص ایسا نہیں ملا جس نے باقی کی شاعری میں کوئی میخ نکالی ہو۔ مگر نہ جانے باقی کی موجودگی میں لوگوں کو کیوں چپ سی لگ جاتی ہے۔

اصل میں باقؔی کے اندر جو شاعر بیٹھا ہوا ہے وہ ہر دم اپنی گردن اکڑائے رکھنا چاہتا ہے۔ چاہے ایسا کرنے سے اس کی گردن میں درد ہی کیوں نہ ہونے لگے باقؔی کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اب وہائٹ کالرڈ شاعر بھی پیدا ہونے لگے ہیں ایک دلچسپ بات اور بھی بتلا دوں کہ باقؔی کے اندر جب شاعر بہت زیادہ بیدار ہوتا ہے تو باقؔی خود اپنے آپ کو "باقؔی صاحب۔ باقؔی صاحب" کہکر مخاطب کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں اپنے ایک حیدرآبادی دوست کے ہمراہ کافی ہاؤس گیا تو دیکھا کہ باقؔی دوستوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ مسئلہ کچھ یوں زیرِ بحث تھا کہ باقؔی فلاں مشاعرہ میں کیوں نہیں گئے۔ بحث پہلے سے جاری تھی اور جب ہم ٹیبل پر پہنچے تو باقؔی دوستوں سے یوں مخاطب تھے۔

"بھئی باقؔی صاحب کو تم جانتے تو ہو۔ وہ کیوں اس طرح کے مشاعروں میں جانے لگیں۔ باقؔی صاحب کو لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ باقؔی صاحب کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ باقؔی صاحب بہرحال باقی صاحب ہیں"۔ غرض وہ بڑی دیر تک باقؔی صاحب ہی کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ ٹیبل سے اٹھ کر چلے گئے۔ جب وہ چلے گئے تو میرے حیدرآبادی دوست نے کہا "یار باقی تو دہلی میں ہی رہتے ہیں۔ ان سے ملنے کی بڑی تمنا ہے۔ بڑا اشتیاق ہے۔ پھر ابھی جو صاحب اٹھ کر گئے ہیں۔ انہوں نے تو اس آتشِ شوق کو اور بھی بھڑکا دیا ہے۔ یار ہماری ان سے ملاقات تو کرا دو" محفل میں زوردار قہقہے بلند ہوئے اور میں نے اپنے دوست کو بتلایا۔ "میاں یہ جو صاحب ابھی تمہاری آتشِ شوق کو بھڑکا رہے تھے وہ اصل میں باقؔی صاحب

ہی تھے۔ باقی صاحب کے راستہ میں خود باقی صاحب حائل ہیں۔ اب یہ تمہاری قسمت ہے کہ ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔"

اور میرا دوست حیران اور سہمی سہمی نگاہوں سے ہمارے قہقہوں کو دیکھ رہ گیا۔ میں یہ بات مذاق میں نہیں بلکہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ حقیقت میں مرحوم سے لے کر باقر مہدی اور شمس الرحمٰن فاروقی تک سب باقی کے سچے قدر دان ہیں۔ موخر الذکر دونا قدوں کی قدر دانی کا میں چشم دید گواہ بھی ہوں۔

ڈاکٹر آرنگ کے گھر پہ ایک محفل میں جب باقی سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی تو شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے، باقی اپنے رتبہ کے حساب سے آخر میں کلام سنائیں گے۔ پہلے میں سنائے دیتا ہوں۔

باقر مہدی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر یہاں مقطع میں سخن گسترانہ بات آگئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ فکر تونسوی کے گھر پہ شعروشراب کی محفل جمی ہوئی تھی۔ محفل کا رنگ دیکھ کر میں نے باقر مہدی سے خواہش کی کہ وہ اپنی کوئی غزل سنائیں۔ اس فرمائش پہ باقر مہدی نے گلاس میں رکھی ہوئی شراب کو ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ اپنے پائپ کو الگ رکھا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ باقی کے سامنے جوڑتے ہوئے کہا "باقی کے سامنے میری کیا مجال کہ میں شعر سناؤں۔ آج ہم باقی کو سنیں گے۔ باقی دی گریٹ"۔

باقی، باقر مہدی کی اس ادا پہ کچھ اس طرح فریفتہ ہوئے کہ اپنے گلاس کی ساری شراب، جو کافی مقدار میں تھی، باقر مہدی کے گلاس میں انڈیل دی۔ باقر مہدی نے اسی

سرعت کے ساتھ یہ شراب بھی ایک ہی گھونٹ میں پی لی۔ ایک لمبا سانس لیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور کہا "اچھا بھئی تو لو ہم تمہیں اپنی غزل سناتے ہیں"۔ اس کے بعد باقر مہدی پورے ایک گھنٹے تک اپنی غزل پینترے بدل بدل کر سناتے رہے۔ کبھی ترنم سے کبھی تحت اللفظ کبھی بیٹھ کر کبھی کھڑے ہو کر اور کبھی لیٹ کر۔ اور میں باقی کی معصومیت اور باقر مہدی کی غزل دونوں پر باری باری سے اپنے دل میں مسکراتا رہا۔ میں باقی کو یہ دوستانہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ مستقبل میں کبھی اپنے حصے کی شراب ناقدروں کو نہ دیا کریں۔ یوں بھی ناقدروں کو اپنے کلام کے سوائے اور کچھ نہیں دینا چاہیئے ایسی دریا دلی سے کیا فائدہ جس میں نہ خدا ہی ملے نہ وصال صنم۔

باقی کو میں نے جب بھی دیکھا دو چھڑیوں کے ہمراہ پایا جو ہمیشہ ایک دوسرے کو نہ صرف حسرت بلکہ کنور سین حسرت کی نظر سے دیکھتی رہتی ہیں۔ باقی کی نہ جانے ایسی کیا کمزوری ہے کہ کنور سین حسرت اور چھڑی کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ ادبی محفل میں جانا ہوگا تو کنور سین ان کے ساتھ ہوں گے کہیں کام پر جانا ہوگا تو کنور سین تب بھی ساتھ ہوں گے۔ کسی دور دراز مقام پر مشاعرہ پڑھنے جائیں گے۔ تو تب بھی کنور سین ان کے ساتھ ہوں گے۔ اب تو مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ اگر خدا نخواستہ باقی کو جہنم میں جانا پڑے تو تب بھی وہ کنور سین کو زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ کنور سین کو بہرحال ایک نہ ایک دن اپنے کیئے کی سزا ضرور ملے گی۔

ایک دن میں نے کنور سین حسرت سے تنہائی میں، جو بڑی مشکل سے میسر آتی

ہے، پوچھا "حسرت صاحب ! یہ آپ ہردم باقی کے ہاسویل کیوں بنے پھرتے ہیں؟"

تنک کے بولے "برخوردار ! جانسن اور باقی تو آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر باسویل صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں" پھر اپنی "تادیل کے تابوت میں آخری کیل اقبال کے اس مصرعہ سے ٹھونکی کہ ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس کے بعد پھر کبھی میری ہمت نہیں پڑی کہ اس بند تابوت کو کھولوں۔

باقی ایک سچے اور مخلص دوست ہیں وہ اپنے ہر دوست اور اپنے ہر شناسا کی دل سے عزت کرتے ہیں۔ حد ہو گئی کہ تادم تحریر وہ میرے بھی مداح ہیں۔ آگے کا حال خدا جانے۔ دوستوں کی عزت افزائی اور قدردانی کے معاملہ میں وہ کچھ کچھ سوشلزم کے قائل ہیں۔ شاعر چھوٹا ہو یا بڑا اگر اپنا شعر باقی کو سناتا ہے تو باقی اس پر ہمیشہ یکساں داد دیں گے۔

میں اب اس خاکہ کے مقطع کی طرف جا رہا ہوں۔ مگر آپ گھبرائیے نہیں میں اس میں اپنی تعریف نہیں بلکہ باقی کی ہی تعریف کروں گا۔ میں باقی کے اس خیال سے متفق ہوں کہ وہ اس دور کے بڑے شاعر ہیں مگر میں باقی سے یہ درخواست کروں گا کہ آج وہ میرے اس خیال سے متفق ہوں کہ باقی اس دور کا بڑا شاعر ہے۔ اچھی رائے کے معاملہ میں کبھی کبھی دوستوں کی رائے سے بھی متفق ہونا چاہیئے۔

کبھی کبھی رات کو جب میں تھکا ماندہ گھر پہنچتا ہوں اور اتفاق سے باقی کا مجموعۂ کلام

میرے ہاتھ پڑ جاتا ہے تو رات کتنی حسین دکھائی دینے لگتی ہے۔ ستارے باقی کے شعروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ رات کا سناٹا باقی کی زبان بولنے لگتا ہے بستر کی سفید چادر باقی کے بے داغ فن کی طرح دمک اٹھتی ہے۔ زندگی کی بے ترتیبی پہ باقی کے لہجہ کا قرینہ چھا جاتا ہے۔ سارا وجود روئی کے گالوں کی طرح سبک بن جاتا ہے۔ پھر میں سوچنے لگتا ہوں باقی شاعر ہے یا جادوگر؟

ایک بار باقی نے چند بے تکلف احباب کی محفل میں بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا "یارو اردو کے اس دورِ زوال میں بڑی عظیم شاعری ہو رہی ہے۔ مگر اس دورِ زوال کے بعد کیا ہوگا؟۔ ہم جو چند احباب آج یہاں بیٹھے ہیں کیا آنے والے کل کی گرد میں بھی ایسے ہی احباب بیٹھیں گے"۔ باقی کی یہ بات مجھے ہر لمحہ جھنجھوڑتی رہتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم سب اپنی اپنی گمنام شہرتوں کی صلیبیں اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے مقتل کی طرف جا رہے ہیں۔ جہاں ہم خود اپنے آپ کو مصلوب کریں گے۔ اس کے بعد نہ ہمارا کوئی حرف معتبر ہوگا اور نہ ہی کوئی رنگوں کا حساب پوچھے گا۔ آخر میں اس خاکہ کو باقی کے اس پُر امید شعر پر ختم کرنا چاہوں گا ؎

اے ساعتِ ازل کے ضیا ساز فرشتے
رنگوں کی سواری کے نکلنے کی خبر دے

٭ ٭ ٭

(نومبر ۱۹۷۶ء)

مخمور سعیدی

بحیثیت مجموعی آدمی

جنوری ۱۹۶۵ء کی ایک شام کو حیدرآباد کی صنعتی نمائش میں ایک دوست نے مجھ سے پوچھا: "آپ مخمور سعیدی کو جانتے ہیں؟"

میں نے کہا: "وہ جو ٹونک کے رہنے والے ہیں؟"

دوست بولا: "جی ہاں"

پھر میں نے کہا: "وہ جو تحریک سے وابستہ ہیں؟"

دوست بولا: "جی ہاں"

میں نے کہا: "وہ جن کی تصویر ابھی ایک رسالہ میں چھپی تھی، جس میں انہوں نے اپنے گلے کے اطراف ایک خوبصورت مفلر یوں لپیٹ رکھا تھا جیسے مفلر کی مدد سے خودکشی کرنے جا رہے ہوں"

دوست بولا: "جی ہاں! بالکل وہی! مگر یہ تمہیں مفلر کیسے یاد رہ گیا؟"

میں نے کہا: "دیکھتے نہیں کیسی غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔ مفلر یاد نہیں آئے گا تو اور کیا یاد آئیگا۔ میں تو ہمیشہ مطلب کی چیز یاد رکھتا ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو سردی کا مقابلہ کرنے کے لیئے عصمت چغتائی کا "لحاف" اور منٹو کی "کالی شلوار" پڑھتے ہیں۔"

دوست بولا: "تم بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔ حالانکہ بات مخمور سعیدی کی ہو رہی تھی۔"

میں نے کہا: "اور میں نے بات کا رخ مخمور سعیدی کے مفلر کی طرف موڑ دیا تھا تم سے مشکل یہ ہے کہ جب بھی کسی شاعر کے بارے میں بات کرتے ہو تو اس کی شاعری کو ہی بات کا موضوع بناتے ہو۔ حالانکہ شاعر کے پاس، اور وہ بھی اردو شاعر کے پاس کبھی کبھی مفلر بھی ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھو کہ مخمور کے پاس ایک قابل اشاعت مفلر بھی ہے جو ان کی غزل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ تم غزل کی تعریف تو کروگے لیکن مفلر کو یکسر بھول جاؤگے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم شاعر کو اس کی شاعری سے ہی ناپیں۔ کبھی کبھار مفلر کو بھی شاعر کی جانچ کا پیمانہ بننا چاہیئے۔ جبھی تو ہم کسی شاعر کی ٹوٹل پرسنالٹی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکتے ہیں۔"

میرے دوست نے جھنجھلا کر کہا: "یار یہ مذاق بند کرو۔ مجھے بتاؤ کیا تم مخمور سعیدی سے ملنا چاہو گے؟"

میں نے کہا: "ضرور ملوں گا بشرطیکہ وہ اپنے گلے کے اطراف وہی تصویر

والا مفلر لپیٹ کر آئیں "۔

اور میرے دوست نے نمائش میں لگے ہوئے کتابوں کے ایک اسٹال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو! وہ مخمور سعیدی کھڑے ہیں"۔

اور میں نے دیکھا کہ مجھ سے چالیس قدم کے فاصلے پر ایک نوجوان وہی مفلر لپیٹے کھڑا تھا۔ جی ہی [illegible] کہ مخمور سعیدی سے ملا جائے مگر نہ جانے کیوں چالیس قدم کا یہ فاصلہ مجھ سے طے نہ ہو سکا۔ مجھے یوں لگا جیسے مخمور میں اور مجھ میں اتنا ہی فاصلہ حائل ہے جتنا کہ امریکہ اور روس کے درمیان۔

میرے دوست نے اسٹال کی طرف مجھے کھینچ کر لے جاتے ہوئے کہا۔ "حسن اتفاق دیکھو کہ مخمور نے وہی مفلر لپیٹ رکھا ہے۔ چلو تمہیں مخمور سے ملائیں"۔

میں نے ایک لمحہ میں اپنے دوست کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا "یار! اب رہنے بھی دو میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔ پھر تم تو جانتے ہو کہ میں شاعروں سے نہیں ملتا کیوں کہ اس میں نقصان میرا ہی ہوتا ہے۔ [illegible] تو ان کے شعر سنو۔ پھر انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور اگر خوش قسمتی سے اس کوشش میں ناکامی ہوئی تو گلا پھاڑ پھاڑ کر داد بھی دو۔ میں گھاٹے کے سودے کا قائل نہیں ہوں"۔

یہ کہہ کر میں دوسری جانب چلا گیا۔ میرا دوست میرے پیچھے پیچھے پکارتا ہوا چلتا رہا۔ اس وقت ہم دونوں کے درمیان کچھ اس قسم کی بات چیت ہوئی۔

"یار تم مخمور سے مل تو لو۔ تم اس سے مل کر خوش ہو گے"۔

"میرے پاس خوش ہونے کے اور بھی بہت سے ذریعے ہیں۔ میری زندگی

میں ابھی خوشی کا اتنا کال نہیں پڑا ہے کہ محض خوش ہونے کے لئے مخمور ہے ہوں"۔

"مگر یار! وہ بڑا نفیس آدمی ہے"۔

"نفیس آدمی ہوا تو کیا؟ شاعر بھی تو ہے"۔

"مگر شاعر بھی بہت بڑا ہے"۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ اردو میں آج تک کوئی چھوٹا شاعر پیدا ہی نہیں ہوا"۔

"میری بات سنو۔ بحیثیت مجموعی وہ بہت اچھا شخص ہے"۔

"میری بات بھی تو سنو کہ میں بحیثیت مجموعی قسم کے اشخاص سے ملنا پسند نہیں کرتا"۔

اس کے بعد میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے دوست اور مخمور سعیدی کی خوبیوں کے دائرے سے بہت آگے نکل گیا ورنہ نہ جانے اس دن مخمور کی اور کتنی خوبیاں مجھے سننا پڑتیں۔ میں آگے جانے کو نکل تو گیا مگر بڑی دیر تک میرے کانوں میں یہ جملے گونجتے رہے" وہ بڑا نفیس آدمی ہے۔ بڑا اچھا شاعر ہے۔ بحیثیت مجموعی ایک اچھا انسان ہے"۔

حیدرآباد کی نمائش میں مخمور چالیس دن تک کتابوں کا اسٹال لگائے بیٹھے رہے لیکن تب بھی مجھ سے چالیس قدم کا یہ فاصلہ طے نہ ہو سکا۔ وہ غالباً اس بک اسٹال میں نیشنل اکاڈمی کی کتابیں فروخت کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میں تو کبھی اس بک اسٹال میں نہیں گیا۔ میں نمائش

کلب کا ممبر تھا اور ہر شام کو "سیاست" اخبار کے دفتر سے نکل کر یہیں آ ہی کلب میں جایا کرتا تھا۔ اور کلب کے دروازے کے عین سامنے مخمور نے اپنی کتابوں کا اسٹال کچھ اس طرح لگا رکھا تھا جیسے ؎

بستر لگا دیا ہے تیرے در کے سامنے

چالیس دن تک میں آتے جاتے مخمور کا دیدار کرتا رہا۔ مخمور ان دنوں صرف مخمور تھے مطلب یہ کہ وہ ابھی اتنے "سعیدی" نہیں بنے تھے جتنے کہ وہ آج دکھائی پڑتے ہیں۔ آدمی کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس کی "سعیدی" میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو سہیل سعیدی اور مخمور سعیدی دونوں کی موجودہ "سعیدیوں" کا تقابل کرکے دیکھ لیجئے۔ خیر تو مخمور حیدرآباد کی نمائش میں کتابیں بیچنے کے لئے آئے تھے مگر میں نے انہیں کبھی کتاب بیچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کے اسٹال پر ہمیشہ نو عمر شاعروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ قیاس غالب ہے کہ مخمور ان نو عمر شاعروں کو اپنا کلام سناتے ہوں گے۔ اور از راہ احتیاط کبھی کبھار ان شاعروں کا کلام بھی سن لیتے ہوں گے۔ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ کتابوں کی فروخت کے کاروبار کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کتب فروش جتنا جاہل ہو گا اتنی ہی زیادہ علمی کتابیں فروخت کر سکے گا۔ پڑھا لکھا آدمی جب کتابیں بیچنے لگتا ہے تو کتابیں نہیں بیچتا بلکہ کتابوں کی آڑ میں اپنے تحفظات، اپنے تصورات یا پھر اپنے تعصبات بیچنے لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مخمور کے اسٹال پر کبھی کسی کتاب کو بکتے نہیں دیکھا۔ یا تو وہ بے فکرے اور بے روزگار قسم کے نوجوان شاعروں کے طرف

جمع رہتے یا پھر وہ اکیلے بیٹے اپنے ہی اسٹال کی کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتے
حیدرآباد میں ان کے اعزاز میں بعض مخدوش قسم کے خیر مقدمی جلسے بھی ہوئے مگر مجھے
کسی بھی خیر مقدمی جلسے میں نہیں گیا۔

نمائش کے آخری دنوں میں مجھے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ کسی نے مخمور کو بھی
میرے بارے میں بنا دیا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ جب بھی میں ان کے
اسٹال کے سامنے سے گزرتا تو مخمور کسی کتاب کی اوٹ میں سے مجھے جھانک کر دیکھنے
کی کوشش کرتے لیکن کبھی مجھ سے ملنے کی جسارت نہیں کی۔ پھر جب نمائش ختم ہوئی
تو مخمور اپنی کتابوں کے بنڈل باندھ کر دہلی واپس چلے گئے۔

۱۹۷۲ء میں جب میں دہلی آیا تو میں نے دہلی کے جن چند شاعروں اور
ادیبوں سے ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان میں ایک شخص کمار پاشی بھی تھا۔ انہی دنوں
کمار پاشی کے افسانوں کا ایک مجموعہ شایع ہوا تھا اور مجھے اس کے بعض افسانے بہت
پسند آئے تھے۔ اب جناب ایک آدمی جب دوسرے آدمی سے ملنا چاہتا ہے تو
یہ نہیں دیکھتا کہ دوسرا آدمی کس کس سے ملتا ہے اور کیا کیا کرتا ہے۔ کمار پاشی سے ملا
تو کمار نے مجھے دوسرے ہی دن اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ دوسرے دن
میں کمار کے ہاں گیا تو دیکھا کہ میرے وہاں پہنچنے کے بعد بھی کسی کا انتظار ہو رہا ہے۔

میں نے پوچھا "کس کا انتظار ہو رہا ہے؟"
کمار نے کہا "مخمور سعیدی آنے والے ہیں۔"

میں نے کہا: مخمور سعیدی! وہی جو ٹونک کے رہنے والے ہیں، جو تحریک سے وابستہ ہیں اور جن کی ایک تصویر کچھ سال پہلے ایک رسالہ میں مقلر کے ساتھ چھپی تھی۔"؟

کمار نے کہا "جی ہاں بالکل وہی! کیا آپ کی مخمور سے ملاقات نہیں ہے"؟

میں نے کہا: کبھی ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کی"۔

اس پر کمار نے کہا "آپ مخمور سے مل کر خوش ہوں گے۔ وہ بڑا نفیس آدمی ہے۔ بہت اچھا شاعر ہے"۔

اور میں نے بات کو کاٹ کر کہا "اور بحیثیت مجموعی ایک بہت اچھا آدمی ہے"۔

سات سال گذرنے کے بعد ایک بالکل ہی دوسرے شہر میں، ایک بالکل ہی دوسرا شخص، مخمور کے بارے میں بالکل وہی رائے دے رہا تھا جو میرے حیدرآباد کے دوست نے دی تھی۔

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا چلو آج ان چالیس قدموں کا فاصلہ طے کر ہی لیا جائے۔ اگرچہ تب بھی میری زندگی میں خوشیوں کا اتنا کال نہیں پڑا تھا کہ محض خوش ہونے کے لئے مخمور سے ملتا۔ اتنے میں مخمور وہاں آ گئے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اسی محفل میں مخمور کتاب کی اوٹ میں سے باہر نکل آئے۔ اسی محفل میں مخمور نے اپنے تیسرے مجموعہ کلام "آواز کا جسم" کا ایک نسخہ مجھے دیا جس پر لکھا تھا:

"مجتبیٰ حسین تمہارے لئے ـــ

وہ جو ہنس ہنس کے سب سے ملتا ہے   خود سے مل کر بہت اداس تھا آج"

اسی رات میں نے مخمور کا سارا مجموعۂ کلام پڑھ لیا اور بہت عرصہ بعد میں نے اپنی رائے بدلی کہ ایک شاعر کو اس کی شاعری سے ہی جانچنا چاہیے۔ میں اس مفلر سے کیا سروکار جو شاعر نے اپنے گلے کے اطراف باندھ رکھا ہے۔

پھر تو صاحب جب جب کمار سے ملاقات ہوتی ہے۔ مخمور سے بھی ضرور ملاقات ہوتی ہے۔ کمار اور مخمور کی دوستی بڑی پرانی ہے۔ حالاں کہ بحیثیت مجموعی دونوں الگ الگ مزاجوں کے حامل ہیں۔ مزاجوں کی بات چھوڑیئے رنگ ہی کو لیجیے۔ کمار سیاہ ہیں تو مخمور سرخ و سپید۔ سچ پوچھیے تو ان دونوں کی دوستی "سیہ بر سفید"[1] قسم کی دوستی ہے۔

میں مخمور کے ماضی سے واقف نہیں ہوں۔ سنا ہے کہ ٹونک میں ان کے گھر پر ہاتھی جھوما کرتے تھے۔ اب ان کے اشعار پر سامعین جھوما کرتے ہیں۔ مگر مخمور کو ہاتھی اور سامعین کے فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ ہاتھی سوچ سمجھ کر جھومتا ہے۔ اور سامعین سوچے سمجھے بغیر ہی جھومتے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ وہ کسی زمانے میں ایک ہوٹل کے منیجر بھی تھے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہوٹل کا کاروبار بھی کتابوں کے اسٹال کی طرح ہی چلاتے رہے ہوں گے۔ اکیلے اکیلے ہی بیٹھے اپنے ہی ہوٹل میں رکھی ہوئی چیزیں کھا کھا کر۔

مخمور تکلیف دہ حد تک ملنسار اور خوش اخلاق آدمی ہیں۔ دن بھر چائے کی دس بارہ پیالیاں پینے کے بعد جی اوب گیا ہے اور اگر ایسے میں مخمور سے ملاقات ہوتی ہے

---

[1] مخمور سعیدی کے دوسرے مجموعۂ کلام کا نام۔

تو مخمور ضرور یہ کوشش کریں گے کہ آپ ان سے کچھ کھا ئیں پئیں ۔ انکار کی صورت میں ان کے اصرار کے تیور یہ بتائیں گے کہ اگر مزید انکار جاری رہا تو یہ مہمان کو پچھاڑ کر نیچے لٹا دیں گے ۔ اور اسے یوں چائے پلائیں گے جیسے چھوٹے بچے کو دوا پلائی جاتی ہے ۔ مخمور ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ اپنی خوش اخلاقی کو دوسروں کے ہنٹروں میں ٹھونسنا چاہتے ہیں ۔" تحریک کے دفتر پہ جب بھی فون کرتا ہوں تو فون پہ یا تو پریم گوپال متل کی " یس بلیز" سے ملاقات ہوتی ہے یا پھر مخمور کے بھاری بھرکم " حضور" سے ۔ اگر کبھی " یس بلیز" سے پہلے سامنا ہو تو پوچھتا ہوں " حضور" کہاں ہیں اور اگر " حضور " سے مڈبھیڑ ہو تو پوچھتا ہوں " یس بلیز" کہاں ہیں ؟ مجھے مخمور کا " حضور" بہت اچھا لگتا ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے لکھنؤ کی ساری تہذیب اس حضور کے پیچھے سے جھانک رہی ہو ۔

پچھلے چار برسوں میں مخمور سے میری بیشمار ملاقاتیں ہوئی ہیں ۔ جلسوں میں ، دوستوں کی محفلوں میں ، تحریک کے دفتر پہ ، میرے دفتر پہ ۔ میں نے مخمور کو بحیثیت مجموعی ایک نیک نفس اور شریف آدمی کے روپ میں پایا ۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مخمور شام گذارنے کے لیے دن گزارتے ہیں ۔ میں نے مخمور کو شاموں سے بھی گذرتے ہوئے دیکھا ہے ۔ کسی بھی لمحہ میں وہ اپنی شرافت اور خوش اخلاقی کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے ۔

مجھے اس وقت ایک بڑی خوشگوار رات کی یاد آرہی ہے جس کا انجام بڑا ناخوشگوار ہوا تھا ۔ گرمی کے دن تھے ۔ آسمان گرد آلود تھا مگر تب بھی اس گرد میں سے چاند اپنی دھندلی دھندلی روشنی پھینک رہا تھا ۔ رات کے گیارہ بجے تھے ،

میں مخمور، کمار پاشی اور دہلی کے دو چار دیگر شعرا حضرات گھومتے گھامتے جامع مسجد کے سامنے والے وسیع میدان میں پہنچے اس میدان میں جا بجا لوگ اس طرح سوئے ہوئے تھے جیسے ایک دوسرے کو ضرب دے رہے ہوں۔ سوئے ہوئے انسانوں کو پھلانگتے ہوئے ہم لوگ ایک چبوترے پر پہنچ گئے۔ طے یہ ہوا کہ ہر شاعر اپنا اپنا کلام سنائے ایک شاعر نے ترنم سے کلام سنانے کی کوشش کی تو سوئے ہوئے لوگ جاگ کر اٹھ بیٹھے اور آہستہ آہستہ ہم لوگوں کے اطراف جمع ہونا شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچاس ساٹھ افراد وہاں اکٹھا ہو گئے اور داد کا باضابطہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعض کاہل افراد ایسے بھی تھے جو سوئے تو نہیں تھے لیکن وہ لیٹے لیٹے ہی اشعار پر داد دینے لگے میں نے دیکھا کہ ایک صاحب مجمع میں سب سے سامنے بیٹھے ہیں اور بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نہ صرف شعروں پر داد دے رہے ہیں بلکہ شعرا سے شعروں کو مکرر بھی پڑھوا رہے ہیں۔ چاندنی اتنی دھندلی تھی کہ اس میں ان کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن ان کا حلیہ مجھے اس وقت کچھ ایسا لگا کہ بے ساختہ ان کے ساتھ عملی مذاق کرنے کو میرا جی چاہا۔ اس اثنا میں اور بھی بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے جب میں نے دیکھا کہ ہماری مخصوص محفل شعر جنس تبدیل کر کے باضابطہ مشاعرہ میں بدل رہی ہے تو میں بڑی سنجیدگی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ایک مختصر سی تقریر شروع کر دی

"حضرات! دہلی کا یہ آخری یادگار مشاعرہ ہے۔ جو اب تک صدر مشاعرہ کے بغیر چل رہا ہے۔ لیکن مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ اس مشاعرے کے صدر تشریف لا چکے ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مسند صدارت

پر جلوہ افروز ہو کر مشاعرہ کو رونق بخشیں: اس کے ساتھ ہی میں نے ایک پتھر پر اپنا رومال بچھا کر "مسند صدارت" تیار کر لی اور آگے بڑھ کر ان صاحب کو جو شعروں پر بہت سنجیدگی سے داد دے رہے تھے، ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور "مسند صدارت" پر لا بٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی مجمع نے تالیاں بجائیں اور میں نے دیکھا کہ "صدر مشاعرہ" واقعی بڑی سنجیدگی کے ساتھ یوں بیٹھے ہیں جیسے عام طور پر مشاعروں کے صدر بیٹھتے ہیں۔ کسی نے پکار کر پوچھا: "ہمارے صدر مشاعرہ کا کیا نام ہے؟" اس پر میں نے کہا "صدر مشاعرہ کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ مشاعروں کے سارے صدر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان پر ناموں کی تہمت نہیں آنی چاہیئے۔"

اس کے بعد باضابطہ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ چونکہ میں اکیلا ہی غیر شاعر رہ گیا تھا اس لئے میں بزعم خود اس مشاعرہ کا کنوینر بن گیا اور مشاعرہ کی کارروائی چلانے لگا۔ مشاعرہ کی کارروائی چلانے کا مقصد کم از کم میرے نزدیک یہی تھا کہ میں "صدر مشاعرہ" کے ساتھ عملی مذاق کروں۔ میں نے سب سے پہلے مخمور کا نام پکارتے ہوئے کہا: اب میں ملک کے ایک طرحدار شاعر کو زحمت دینا چاہتا ہوں جن کا تعلق ٹونک کی مردم خیز سرزمین سے ہے۔ مخمور سعیدی ہم سب کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ وہ غزل کہنے کا بڑا البیلا ڈھنگ رکھتے ہیں۔ تو آیئے، سنیئے مخمور سعیدی سے ان کی ایک غزل:

مخمور زیر لب مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور از راہ مذاق "صدر مشاعرہ" کی طرف دیکھ کر پوچھا: "اجازت ہے؟" اس پر صدر مشاعرہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا "مخمور صاحب! اجازت تو ہے لیکن میری خواہش یہ ہے کہ آپ اپنی وہ غزل سنائیں جو "شب خون" کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی ہے۔"

صدر مشاعرہ کا یہ جملہ سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اور مخمور کی آواز بیٹھ گئی۔

"یہ تو کوئی جغادری صدرِ مشاعرہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کمار سے کہا۔

یار! ہم نے غلطی سے "صحیح" صدر مشاعرہ کا انتخاب کر لیا ہے۔ اب کیا ہو گا؟"

مخمور نے صدر مشاعرہ کی فرمائش پوری کر دی اور مجمع تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس کے بعد صدر مشاعرہ نے داد دینے کے انداز میں مخمور سے کہا "مخمور صاحب! کیا ڈکشن ہے۔ کیا آہنگ ہے! آپ کی اس غزل میں جو اساطیری فضا ہے۔ وہ اس غزل کی جان ہے۔ بھئی سبحان اللہ۔"

اب کی بار کسی بھی لمبی چوڑی تمہید میں گئے بغیر میں نے کمار پاشی کو کلام سنانے کی دعوت دی۔ کمار کلام سنانے لگے تو میں سرک کر مخمور کے قریب پہنچا اور کہنے لگا:

بھئی! ذرا غور سے تو دیکھو کہ اس "پردۂ زنگاری" میں کون معشوق ہے؟"

مخمور نے کہا "مجھے تو یہ شمس الرحمان فاروقی لگتے ہیں کیونکہ صدرِ مشاعرہ کی بات چیت کا ڈکشن بھی بتا رہا ہے۔"

میں نے اور مخمور نے چاند کی دھندلی دھندلی روشنی میں "صدرِ مشاعرہ" کے چہرے پر شمس الرحمان فاروقی کے چہرے کے خطوط کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر فضا اتنی گرد آلود تھی کہ کبھی کبھی صدرِ مشاعرہ پر ڈاکٹر وزیر آغا تک کا گمان ہونے لگا۔

اس کے بعد مشاعرہ بڑی آن بان کے ساتھ جاری رہا اس یادگار مشاعرہ کے

دو تین دور چلے۔ آخر میں میں نے سوچا کہ جب مذاق کرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ صدرِ مشاعرہ کو "صدارتی تقریر" کرنے کی زحمت دی جائے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اعلان کیا: "حضرات! ہمارا مشاعرہ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ میں سب سے آخر میں آج کی محفلِ مشاعرہ کے صدر سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے زرّیں خیالات سے ہمیں مستفیض فرمائیں۔"

یہ سنتے ہی صدرِ مشاعرہ بڑی سنجیدگی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے جدید نظم کی تاریخ بیان کرنی شروع کر دی۔ عصری حسیت، تنہائی کا کرب، ترسیل کا المیہ، کافکا، ٹی ایس ایلیٹ، ژاں پال سارتر اور اساطیری علائم۔ نہ جانے وہ کیا کیا کہتے رہے۔ اور ہم بھونچکے ہو کر ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے رہے۔ ابھی صدرِ مشاعرہ کی تقریر جاری ہی تھی اور وہ مخمور کی شاعری پر اظہارِ خیال کرنے ہی والے تھے کہ اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ اندھادھند بھاگنے لگے۔ ایک شخص نے بھاگتے بھاگتے کہا: "آپ لوگوں کو یہاں شاعری کی سوجھی ہے اور وہاں بارہ ہندو راؤ میں فساد ہو گیا ہے۔ بھاگو یہاں سے۔"

پھر ہم بھی جدھر کو منہ اٹھ گیا ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر بھاگتے بھاگتے رہ رہ کر میرے ذہن میں یہ خیال آتا رہا کہ دلّی بھی بڑا عجیب شہر ہے۔ جب بھی یہاں آرٹ اور ادب ترقی کرتا ہے ایک نادر شاہ کہیں سے ضرور آجاتا ہے اور سب کچھ لوٹ کر پلٹ جاتا ہے۔ یہ نادر شاہ کبھی انگریز بن کر آتا ہے اور کبھی فسادی بن کر نازل ہوتا ہے۔ ہم لوگ بڑی مشکلوں سے اپنے اپنے گھروں کو پہنچے۔ بعد میں کئی دنوں تک

ہم لوگ دلی کے اس آخری یادگار مشاعرے کے صدر کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ زندگی کی کئی حسین راتیں یوں ہی اپنا سراغ بتائے بغیر چھپ جاتی ہیں۔

مخمور کے ساتھ ایسی ہی کئی شاموں کی یادیں وابستہ ہیں۔ مخمور کو میں نہ صرف بحیثیت شخص بلکہ بحیثیت شاعر بھی پسند کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مخمور جدید شاعر ہیں۔ حالانکہ وہ نہ تو زبان کی غلطی کرتے ہیں اور نہ ہی مصرعے کو وزن سے گراتے ہیں۔ پھر وہ کاہے کے جدید شاعر ہیں؟ میں ناقد تو ہوں نہیں کہ مخمور کی شاعری کی چیر پھاڑ کر کے اس کی خوبیاں اور خامیاں گناؤں۔ یہ نیک کام میں نے کبھی نہیں کیا ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ جو بات دل کو چھولے، چاہے وہ گالی میں کیوں نہ ہو اور وزن میں دی گئی ہو بڑی عظیم ہوتی ہے۔ مخمور کی شاعری کو پڑھتے وقت اکثر مقامات پر میرے ذہن میں توسِ قزح سی تن جاتی ہے۔ اب تنقید کی زبان میں ایسی توسِ قزح کو کیا کہتے ہیں یہ میں نہیں جانتا۔ میں تو صرف اپنی زبان میں بات کرنا جانتا ہوں ــــ

مخمور کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ کسی کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ اِدھر دو چار برسوں میں جتنے شعری مجموعے چھپے ہیں ان میں سے ایک چوتھائی مجموعوں کے مقدمے مخمور نے لکھے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اب وہ از راہِ احتیاط دو چار فاضل مقدمے اپنے ہاں تیار کر کے رکھتے ہیں کہ کون جانے کب کونسی بلا نازل ہو جائے۔

مخمورؔ کی بیماریوں کا ایک علاج ہے مشاعرے۔ وہ پڑھا جائیں گے مقدمے وہ لکھیں گے، تحریک کا کام وہ کریں گے، مشاعروں کا اہتمام وہ کریں گے اور تو اور۔ پچھلے دنوں یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ مخمورؔ مسز مخمورؔ کے امتحان کی تیاری میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میں بہت سے ایسے شاعروں اور ادیبوں سے واقف ہوں جو شادی شدہ تو ہوتے ہیں لیکن "شوہر" ہرگز نہیں ہوتے۔ مخمورؔ تو خیر سے نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ "شوہر" بھی ہیں۔

مخمورؔ کے بارے میں میرے پاس کہنے کو بہت سی باتیں ہیں لیکن بار بار میرے کانوں میں میرے حیدرآبادی دوست کے یہ جملے گونجتے رہتے ہیں کہ "مخمورؔ سے مل کر تم خوش ہو گئے" مخمورؔ بڑا نفیس آدمی ہے، مخمورؔ بحیثیت مجموعی اچھا آدمی ہے" چالیس قدم کے فاصلے کو پھلانگنے کے بعد اب اگر کوئی مجھ سے مخمورؔ کے بارے میں رائے پوچھے تو شاید میں یہی انورٹیڈ کاما نہ (INVERTED COMMAS) والی رائے ہی دے دوں گا ۔

جو کچھ نہیں، کسی دشمن کا ذکر ہو مخمورؔ
سکوت ہے یہ سر بزم دوستاں کیسا

اور آج میں نے دشمن کا نہیں، ایک دوست کا ذکر کر کے بزم دوستاں کو توڑ دیا ہے۔

۔۔۔

مُصنّف کی دیگر تصانیف

شیشہ و تیشہ

(مشہور کالم نگار شاہد صدیقی مرحوم کے کالموں کا انتخاب)

تکلف برطرف (مضامین)

قطع کلام (")

قِصّہ مختصر (")

بہرحال (")

(زیرِ ترتیب)

بالآخر۔ مضامین

جاپان چلو، جاپان چلو (سفرنامہ)

"تم نے اس خاکسار کا جو خاکہ لکھا ہے وہ اتنا دل آویز ہے کہ تمہارے قلم کی بلائیں لینے کو جی چاہنے لگا ہے اسے پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔

اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا:

تونے یہ کیا غضب کیا، مجھکو ہی فاش کردیا
میں ہی تو ایک داغ تھا سینۂ کائنات میں

خاکہ نگاری میں واقعی آپ کو کمال حاصل ہے۔ خدا کرے آپ کا تخیل ہمیشہ جواں رہے"

کنہیالال کپور

حسامی بکڈپو مچھلی کمان۔ حیدرآباد دکن